ستمبر
2021ء

حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ ۝۵ (القرآن:54)

جدید تعلیم یافتہ حضرات میں علوم قرآنی کے فروغ کا نقیب

قرآن اکیڈمی جھنگ

جلد : 15 | وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ (القران) | صفر : 1443ھ
شمارہ : 09 | اور ہم نے قرآن کو سمجھنے کیلئے آسان کر دیا ہے تو کوئی ہے کہ سوچے، سمجھے (پ سورۃ القمر) | ستمبر : 2021ء

ISSN : 2305-6231

ماھنامہ

حکمتِ بالغہ

جھنگ

مدیر مسئول : انجینئر مختار فاروقی

مشاورت
- ڈاکٹر طالب حسین سیال
- پروفیسر خلیل الرحمٰن
- حاجی محمد منظور انور
- انجینئر عبداللہ اسماعیل

مدیر معاون و نگران طباعت : مفتی عطاء الرحمٰن

انتظامی امور : ملک نذر حسین

قانونی مشاورت : محمد سلیم بٹ ایڈووکیٹ، چودھری خالد اشیر ایڈووکیٹ

اہلِ ثروت حضرات سے تاحیات زرِتعاون پچیس ہزار روپے یکمشت	سالانہ زرتعاون بشمول خصوصی اشاعت اندورنِ ملک 1000 روپے	معمول کا شمارہ 60 روپے

ترسیل زر بنام : انجمن خدام القرآن (رجسٹرڈ) جھنگ

قرآن اکیڈمی جھنگ
لالہ زار کالونی نمبر 2، ٹوبہ روڈ جھنگ صدر
پاکستان پوسٹ کوڈ 35200
047-7630861-0336-6778561

Web site:
www.hamditabligh.net

Email:
hikmatbaalgha1@yahoo.com

پبلشر : انجینئر مختار فاروقی
طابع : محمد فیاض، مطبع : سلطان باہو پریس فوارہ چوک جھنگ صدر

اَلْکَلِمَۃُ الْحِکْمَۃُ ضَالَّۃُ الْمُؤْمِنِ فَحَیْثُ وَجَدَ ھَا فَھُوَ اَحَقُّ بِھَا(ترمذی)

حکمت کی بات بندۂ مومن کی گم شدہ میراث ہوتی ہے جہاں کہیں بھی وہ اس کو پائے وہی اس کا حقدار ہے

مشمولات

قرآن مجید کے ساتھ چند لمحات	1		3
بارگاہِ نبوی ﷺ میں چند لمحات	2		5
حرفِ آرزو: امریکہ بمقابلہ طالبان اور ملکی نظامِ تعلیم	3	انجینئر مختار فاروقی	6
عصر حاضر کا مجاہد اعظم (ملا محمد عمر)	4		13
ہم پاکستان کیوں بنانا چاہتے ہیں؟	5	علامہ محمد اسد	29
افغان باقی کوہسار باقی الحکم للہ، الملک للہ	6	محمد منظور انور	54
مدیر کے نام	7		61

ماہنامہ حکمت بالغہ میں قلمی تعاون کرنے والے حضرات کے مضامین معلومات کے تبادلے اور وسیع تر انداز میں خیر کے حصول اور شر سے اجتناب کے لیے چھاپے جاتے ہیں اور ادارے کا مضمون نگار حضرات سے تمام جزئیات میں اتفاق ضروری نہیں۔

یہ رسالہ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو حوالہ ڈاک کر دیا جاتا ہے۔ نہ ملنے کی صورت میں 10 تاریخ تک دفتر رابطہ فرمائیں 10 تاریخ کے بعد رسالہ ارسال نہیں کیا جائے گا (ادارہ)

قرآن مجید

کے ساتھ

چند لمحات

(02)	اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ	آیات
سورۃ البقرۃ	بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ	163-159

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَ الْهُدٰى

بے شک جو لوگ ہمارے حکموں اور ہدایتوں کو جو ہم نے نازل کی ہیں

(بدنیتی سے) چھپاتے ہیں

مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِى الْكِتٰبِ

باوجود یہ کہ ہم نے ان کو لوگوں کے (سمجھانے کے) لیے اپنی کتاب میں

کھول کھول کر بیان کر دیا ہے

اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴿۱۵۹﴾

ایسوں پر اللہ لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والے

(بھی) ان پر لعنت کرتے ہیں

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَ اَصْلَحُوْا وَ بَيَّنُوْا

ہاں جو توبہ کرتے اور اپنی حالت درست کر لیتے اور (احکامِ الٰہی کو)

صاف صاف بیان کر دیتے ہیں

فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ

تو میں ان کے قصور معاف کر دیتا ہوں

وَ اَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۰﴾

اور میں بڑا معاف کرنے والا (اور) رحم والا ہوں

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ مَاتُوْا وَ هُمْ كُفَّارٌ

بے شک جو لوگ کافر ہوئے اور کافر ہی مرے

اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۶۱﴾

ایسوں پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی لعنت

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا

وہ ہمیشہ اسی (لعنت) میں (گرفتار) رہیں گے

لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾

ان سے نہ تو عذاب ہلکا ہی کیا جائے گا اور نہ انھیں کچھ مہلت ملے گی

وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ

اور (لوگو) تمہارا معبود اللہ ایک ہے

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۳﴾

اس بڑے مہربان (اور) رحم کرنے والے کے سوا

کوئی عبادت کے لائق نہیں

صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْمِ

اچھی بات کہنا بھی ایک
صدقہ ہے (الحدیث)

قَالَ النَّبِیُّ ﷺ

اِنَّ الدَّجَّالَ یَخْرُجُ وَ اِنَّ مَعَهٗ مَاءً وَ نَارًا

بے شک دجال نکلے گا اور (جب وہ نکلے گا)

اس کے ہمراہ پانی بھی ہوگا اور آگ بھی

(جو کہ رزق اور مصیبت کے اسباب ہیں وہ ان کو قبضہ میں

لے کر اپنا حکم ماننے پر رزق کا لالچ اور نہ ماننے پر مصیبت کی

دھمکی دے گا لیکن یہ سب دھوکہ ہوگا اور حقیقت یہ ہے کہ)

فَاَمَّا الَّذِیْ یَرَاهُ النَّاسُ مَاءً فَنَارٌ تَحْرِقُ

وہ چیز جس کو لوگ پانی دیکھتے ہوں گے، وہ آگ ہوگی جو جلا دے گی

وَاَمَّا الَّذِیْ یَرَاهُ النَّاسُ نَارًا فَمَاءٌ بَارِدٌ عَذْبٌ

اور وہ چیز جس کو لوگ آگ دیکھتے ہوں گے وہ پانی ہوگا ٹھنڈا میٹھا

فَمَنْ اَدْرَكَ ذَالِكَ مِنْكُمْ

لہٰذا وہ شخص جو تم میں سے اس کو پائے

فَلْیَقَعْ فِی الَّذِیْ یَرَاهُ نَارًا

اُسے چاہیے کہ وہ اُس چیز میں جا پڑے جس کو وہ آگ دیکھتا ہے

فَاِنَّهٗ مَاءٌ عَذْبٌ طَیِّبٌ

کیونکہ وہ پانی ہوگا (حسی طور پر) میٹھا (روحانی طور پر) پاکیزہ

(متفق علیہ عن حذیفہ رضی اللہ عنہ)

بارگاہِ نبوی ﷺ میں چند لمحات

زندگی در جستجو پوشیدہ است
اصل اُو در آرزو پوشیدہ است
علامہ اقبال

امریکہ (عصر حاضر کی اکیلی صہیونی عالمی مغربی سپر پاور)
بمقابلہ طالبانِ افغانستان اور ـــــ ملکی نظامِ تعلیم

انجینئر مختار فاروقی

1 امریکہ (NATO) اور نائن الیون کا واقعہ

امریکہ (بمع NATO) نے نائن الیون (11 ستمبر 2001ء، 23 جمادی الاوّل 1422ھ) کے ڈرامائی واقعے کی آڑ میں افغانستان میں موجود طالبان افغانستان کی حکومت (جسے امریکہ نے خود بھی تسلیم کیا تھا) پر حملہ کر دیا اور طاقت کے نشے میں ایسا ماحول باندھ دیا کہ مغرب زدہ حکمرانوں، صحافیوں، سول و عسکری قیادت (جو امریکی اداروں کے تربیت یافتہ ہو کر امریکی ذہن سے سوچتے اور مغربی آنکھوں سے دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں، UNO کے شیطانی ایجنڈا کو صحیفہ آسمانی سمجھتے ہیں اور آج بھی ان کے ہم خیال غالب اکثریّت میں ہیں) کے تبصرے اور تجزیے گواہ ہیں کہ یہ پس ماندہ ملک اور اس کے باسی بس امریکہ کے لیے ہفتہ عشرہ کی مار ہے اور برطانیہ و USSR کے برعکس امریکہ افغانستان میں فتح یاب ہو جائے گا اور اپنی مرضی کی حکومت قائم کر کے عیش دوام کے مزے لوٹے گا مگر آج 15/اگست 2021ء (20 سال بعد) یہ حقیقت بچشمِ سر دیکھی جا سکتی ہے کہ وہی طالبانِ افغانستان پورے ملک (دارالحکومت کابل سمیت) میں مقتدر ہیں اور امریکی (بمع NATO) افواج کابل کے ائیر پورٹ سے خصوصی پُر امن راہداری لے کر افغانستان سے منہ لٹکا کر وطن روانہ ہو رہے ہیں۔ اللہ کرے کہ افغان طالبان جس مشن (CAUSE) کے لیے آج سے رُبع صدی قبل برسر اقتدار آئے تھے، جس مقصد کی خاطر انہوں نے

2001ء میں اقتدار چھوڑا، 20 سال سربکف رہے اور آج 2021ء میں وہی سرزمین ان کے قدموں میں ہے اور دشمن کھسیانی ہنسی کے ساتھ وطن کی راہ لے رہا ہے، اس مشن یعنی اسلامی حکومت کے قیام کے مشن میں کامیاب ہوں۔ اقبال کے نزدیک یہ منظر کچھ یوں ہے:۔

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحراء و دریا سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

ہمارے نزدیک یہ مقابلہ 'حق بحقدار رسید' والا ہوا ہے اور قدرت نے ان کے خلوص، مستقل مزاجی، مقصد کے لیے قربانی اور ایمان و یقین کی بدولت ان کو دنیا میں سرخرو کر دیا ہے۔

ع اللہ اکبر! یہ لوٹنے کی جائے ہے

2 امریکہ، پاکستان اور افغانستان

آج سے 350 سال قبل (1750ء کے لگ بھگ) دنیا بھر میں صہیونی طاقتوں کا دستِ شفقت برطانوی سامراج کے سر پر تھا اور یہ منحوس سامراج دنیا بھر میں من مانی کر رہا تھا۔ امریکہ میں چھپنے والی کتاب "THE END OF HISTORY & LAST MAN" کا مصنف FUKUYAMA لکھتا ہے کہ 1750ء کے لگ بھگ برطانوی (منحوس) سامراج مسلمانوں کے زیر اقتدار کچھ زمینی علاقوں کے علاوہ باقی خشکی اور سمندروں پر قابض ہو چکا تھا اور اس نے یہ قبضہ بے پناہ مظالم اور یونانی اور رومی اذیت نا کی (TORTURE) کی بدولت حاصل کیا تھا (یاد رہے کہ اگر آپ بھی آج کے غالب WESTERN CULTURE کو انٹرنیٹ پر سرچ کریں تو اس کے جواب میں سامنے آئے گا کہ مغربی کلچر اور تہذیب یونانی علم الاصنام اور رومی طرزِ حکومت کا مجموعہ ہے اور رومی حکمرانوں کا انداز حکومت ROMAN TORTURE کے نام سے سرچ کر کے خود ملاحظہ کریں۔ یہ بات بھی خاص طور پر نوٹ کرنے کی ہے کہ سیّدنا حضرت محمد ﷺ کے ماننے والوں پر ہجرت سے قبل مکی دور میں عربوں نے جو مظالم آزمائے وہ سب انہی رومیوں سے واقفیت کی بنا پر اور ان سے متاثّر ہو کر مخالفین اور کمزوروں پر آزمائے تھے جیسے حضرت سمیّہ رضی اللہ عنہا، حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کی دل دہلا دینے والی شہادت، حضرت خباب رضی اللہ عنہ کو انگاروں پر لٹا دینا اور ایک جنگ میں ابلتے ہوئے تیل میں کسی کو ڈال دینا وغیرہ)۔

قابل ستائش بات یہ ہے کہ آج کے امریکہ نے اسی برطانوی سامراج سے لڑ کر بزورِ

شمشیر آزادی حاصل کی تھی گویا برطانوی منحوس سامراج سے آزادی حاصل کرنے والا پہلا ملک آج کا امریکہ تھا اور 1947ء میں پاکستان دوسرا خوش نصیب ملک۔ مگر افسوس 1950ء سے قبل ہی برطانوی سامراج، صہیونی طاقتوں کے دستِ شفقت سے محروم ہوگیا اور وہ دست شفقت امریکہ کے سر پر آ گیا اور عالمی اقتدار کا ہما اب امریکہ کے سر پر سایہ فگن چلا آ رہا ہے۔ کب تک ایسا ہی رہے گا یہ اللہ بہتر جانتا ہے۔

افغانستان نے 15/اگست 2021ء کو کابل کی فتح سے، امریکی سامراج کے قبضے سے آزاد ہونے والے پہلے ملک کا اعزاز حاصل کرلیا ہے۔ ہماری اللہ تعالیٰ سے دعا ہے اور اس کی رحمت سے امید ہے کہ یہ آزادی پائیدار اور بابرکت ثابت ہوگی۔

پاکستان 1947ء میں منحوس برطانوی سامراج سے آزاد ہوا مگر ہماری بدنصیبی کہ جلد ہی امریکی غلامی اور عالمی بینکوں کی غلامی میں چلا گیا جس کی شدت میں روز افزوں اضافہ ہے۔ افغانستان کے امریکی غلامی سے نکلنے پر مسلمانانِ پاکستان حسرت سے دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے لیے امریکی غلامی سے آزادی کی نوید لے کر کوئی مبارک دن کب آئے گا؟ اَللّٰھُمَّ عَجِّلْ لَنَا ھٰذَا

افغانستان کا امریکی غلامی سے آزاد ہوجانا اور پاکستان میں بالعموم امریکی (منحوس) غلامی کے خاتمے کی آرزو اور جذبہ ہی مفقود ہونے پر اُردو کی ایک نعت کا شعر لکھنے کو دل کر رہا ہے۔ یہ نعت امیر مینائی (1828ء-1900ء) کی ہے۔ ؎

جب مدینے کا مسافر کوئی پا جاتا ہوں　　حسرت آتی ہے یہ پہنچا میں رہا جاتا ہوں

کہاں طالبانِ افغانستان کہ 20 سال میں امریکی سامراج سے گلوخلاصی حاصل کرلی اور کہاں ہم کہ صدیوں کی غلامی کے بعد علامہ اقبال اور قائداعظم جیسے دیدہ ور پیدا ہوئے اور ہم نے 1947ء میں برطانوی سامراج کو گھر کا راستہ دکھایا، امریکی غلامی میں اب 70 سال ہونے کو آئے اس نحوست سے آزادی کی آرزو اور جذبہ ہی کمزور ہے۔ اسی صورتِ حال پر حسرت کا سماں ہے۔

3 پاکستان کے عوام، عسکری وسول قیادت اور افغان طالبان دنیا میں عالمی قیادت کا مرکزِ ثقل مشرق کی طرف آ رہا ہے

محرم 1443ھ کا مبارک مہینہ مسلمانانِ عالم کے لیے بالعموم ایک 'روح افزا' اور

جذبوں کو جلا بخشنے والی خبر لایا کہ افغان طالبان نے امریکہ (و NATO) سے اپنے (چھینے گئے) اقتدار کو 20 سال بعد بزورِ شمشیر (طاقت وقوت اور تائید ایزدی) سے واپس لے لیا۔ افغانستان اور پاکستان میں امریکی نمک خوار NGOs، سیکولر و لبرل طبقہ پر بالعموم صدمہ کی کیفیّت طاری ہے اور ان کی یتیمی اور بیوگی (کہ کوئی سرپرست نہ رہا، اب کیا ہوگا) دیدنی ہے۔ یہ بات اپنی جگہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ 'ہر کمالے را زوال' کے مصداق مغربی صہیونی استعمار (جس کا فی الوقت امریکہ نمائندہ ہے) بھی ماضی کی کئی تہذیبوں، طاقتوں اور سلطنتوں کی طرح اپنے فرعون ونمرود و ابوجہل نما لیڈروں سمیت رُو بہ زوال ہے اور بالآخر مٹ جائے گا اور جلد یا بدیر اسلام یعنی نیکی، شرافت، عفّت، عصمت، شرم وحیا، حسب نسب، حلال معیشت اور آسمانی بادشاہت کا دور آئے گا۔ ہمارے نزدیک تاریخ ایک کروٹ لے رہی ہے اور موجودہ غالب تہذیب زوال پذیر ہے اور اسلام کی طاقت طلوعِ آفتاب کی طرح آہستہ آہستہ سامنے آ رہی ہے افغان طالبان کی دوبارہ حکومت اسی PHENOMENON کا مظہر ہے۔ (واللہ اعلم)

طالبان افغانستان اور نیٹو سربراہ امریکہ کے درمیان جو دوحہ مذاکرات ہوئے، جس کے نتیجے میں امریکہ نے افغانستان سے تمام فوجیں واپس بلانے کا حتمی PLAN دے دیا اور اسی پر عمل درآمد کے نتیجے میں اب طالبان نے کابل میں اقتدار حاصل کیا ہے، ان مذاکرات کے لیے نتیجے میں جو AGREEMENT ہوا وہ 29 فروری 2020ء کا دن تھا یکم مارچ 2020ء میں جو فوٹو اخبارات کی زینت بنا وہ بتا رہا تھا کہ ایک طرف ایک امریکی اعلیٰ حکومتی عہدیدار جو امریکی بیوروکریسی کا منجھا ہوا سیاستدان اور ماہر مذاکرات تھا اور دوسری طرف (الوداعی ہاتھ ملاتے ہوئے) ایک سادہ لباس میں ملبوس، متشرع مسلمان جو بظاہر سادہ لوح مسلمان نظر آ رہا ہے یہ منظر دنیا نے گزشتہ کئی صدیوں سے نہیں دیکھا۔ افغان طالبان نے یہ کامیاب مذاکرات کیے، ان پر عمل درآمد ہوا اور ایک ڈیڑھ سال بعد وہ افغانستان میں حکومت بنانے کے مرحلے میں داخل ہو چکے ہیں۔ اب دنیا کو باعمل مسلمانوں کی شکلیں عالمی سیاست میں کثرت سے نظر آئیں گی جو داڑھی، ٹوپی، سادگی اور اسلامی شعائر پر عمل کے اعتبار سے بھی مسلمان نظر آئیں گے۔ برٹرینڈ رسل کی کتاب "REAWAKENING OF EAST" کا یہی مطلب ہے کہ تاریخ مغرب اور مشرق

میں اقتدار کا جھولا جھول رہی ہے کبھی عالمی اقتدار مشرق میں اور کبھی مغرب میں چلا جاتا ہے۔ اب کئی صدیوں بعد یہ اقتدار دوبارہ مسلمانوں کو نصیب ہونے والا ہے۔

افغانستان کے حالات کے بارے میں وقت ہی بتائے گا کہ دنیا ان کے ساتھ کیا رویّہ رکھتی ہے، صہیونیّت کیا رول ادا کرتی ہے، پاکستان اور دیگر مسلم ممالک کیا کرتے ہیں اور طالبان اپنے عظیم مقاصد میں کس حد تک کامیاب ہوتے ہیں ان حقائق کو UNFOLD ہونے میں وقت ہی درکار ہے۔ کاش دنیا افغانستان کے طالبان کو بھی ایک انسانی اکائی سمجھ کر اپنے نظریات پر ایک فلاحی مملکت قائم کرنے کا موقع دے تو یقین ہے کہ اسلامی تعلیمات میں اتنی جان ہے کہ وہ عصر حاضر میں بھی اپنا لوہا منواسکیں۔ ہماری دُعا ہے کہ افغانستان میں نوزائیدہ طالبان حکومت مضبوط و مستحکم ہو پائیدار ہو اور انسانیت کے لیے مثبت اعلیٰ انسانی اقدار کی حامل ثابت ہو۔ وما ذالك على الله بعزيز

4 پاکستان، افغانستان کا اسلامی مستقبل اور دوقومی نظریے کا عکاس خداشناس، قرآن شناس اور اقبال شناس نظام تعلیم کی ضرورت

- 15 اگست 2021ء سے پہلے کا افغانستان ایک جمہوری لبرل، سیکولر، UNO کی انسان دشمن، عورت دشمن اور اسلام دشمن قراردادوں کا پابند اور ان اقدار کا PROMOTER ملک تھا۔ جبکہ 15/اگست کے بعد اب وہاں طالبان افغانستان آگئے ہیں۔ ان کے نظریات سب کے سامنے ہیں۔
- سابقہ حکومت میں بھی ایک نظام تعلیم تھا جو اس وقت کے مقتدر طبقات اور سرپرست امریکہ کا دیا ہوا تھا اس نظام تعلیم میں بچے اور بچیاں زندگی کے 15-20 سال لگا کر وہ کچھ بنتے تھے جو امریکہ، UNO اور ان کے SPONSORS چاہتے ہیں یعنی WASP یا ZIONISTS۔ ان کے طلباء کی زندگی میں EMOTIONS, ENTERTAINMENTS, THINKING, VALUES, AMBITIONS, LIFE TARGETS, HUMAN RELATION, ATTITUDE TOWERS ELDER & PARENTS MARRIAGE DRESS کا ایک خاص امریکی سانچے میں ڈھلا ہوا مزاج ہوگا۔

◐ اب 15/اگست کے بعد کی حکومت طالبانِ افغانستان کی حکومت ہے کوئی عقلمند انسان یہ باور نہیں کرسکتا کہ وہ اسی نظامِ تعلیم اور انہیں سابقہ دورِ حکومت کے نصاب اور اس کے نتیجے میں نئی نسل میں پیدا ہونے والی MORALLESS اور VALUELES ذہنیت کو OWN کرکے چلائیں گے۔

طالبانِ افغانستان کی سوچ ایک اسلامی سوچ ہے وہ یقیناً پرانے نصاب کو جلا دیں گے یا سمندر میں پھینک کر نیا نصاب (SINGLE NATIONAL CURRICULUM) جاری کریں گے جس میں افغان عوام کے بچے 15-20 سال گزار کر عملی زندگی میں طالبان بنیں۔ وہ عملی زندگی میں آئیں تو ناچ، گانا، فلمی اور سیکولر و لبرل کلچر سے دور ہوں CO-EDUCATION کی بجائے SEGREGATION OF SEXES کے اسلامی اصولوں پر نیا نظام تعلیم بنائیں گے جوان کی آئندہ نسلوں کو گویے، آرٹسٹ، DRAMATIST، فلمی ستارے، مرد و زن کا اختلاط والا معاشرہ بنانے کی بجائے اسلامی رنگ دے سکیں تاکہ ان کا بنایا ہوا شریعت اسلامی پر مبنی عادلانہ اسلامی نظامِ حکومت نسلوں تک چلتا رہے۔

◐ اسی بحث پر قیاس کیا جاسکتا ہے کہ پاکستان کا موجودہ نظام تعلیم (بشمول SNG کا تفصیلی ڈھانچہ) نہ اسلامی ہے نہ پاکستانی، نہ علامہ اقبال کی افکار سے مطابقت رکھتا ہے، نہ آئینی ہے نہ ہی پاکستانی علاقائی مسلمان رہن سہن (1947ء سے پہلے کا) سے MATCH کرتا ہے اور نہ ہماری اسلامی بلوچ، پختون، پنجابی سندھی روایات (منحوس برطانوی استعمار سے پہلے کی) کا عکاس ہے۔ بلکہ خالصتاً مغربی، صہیونی، امریکی اور UNO کا DICTATED ہے اور اس کی قراردادوں کے تابع ہے۔ لہٰذا ــــ اس نظام کی کسی سطحی تبدیلی (FACIAL TREATMENT) سے پاکستان کا وارث طبقہ اور نسل پیدا نہیں ہوسکتی جو ــــــ

✹ دوقومی نظریہ پر یقین رکھتا ہو کہ ہندو (غیر مسلم) انسان ہیں مگر مذہب تعلیمات میں مسلمانوں سے جدا ہیں ان کے کھانے، خوشی غمی منانے کے طریقے، لباس، روایات، عبادت گاہیں سب کچھ مختلف ہیں۔

✹ جو دور صحابہ کے اسلام کو سمجھ کر اسلام کے آج کے تقاضوں (SCENARIO) کے مطابق ملک میں عمل درآمد کراسکیں جس کے لیے مفکرِ پاکستان علامہ اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح

کے بیسوں بیانات گواہ ہیں (سوائے ایک فرضی تقریر جو 11/اگست کے دن سے منسوب ہے اور جوان کے سارے دس سالہ مسلم لیگی کیریئر کے متضاد ہے)۔

- جس نصابِ تعلیم سے نکل کر جب ہماری نئی نسل عملی زندگی میں آئے تو اچھے مسلمان ثابت ہوسکیں اور حضرت محمد ﷺ کے سچے اُمتی بن سکیں (نہ کہ موجودہ نظام کے پروردہ ہالی وڈ اور بالی وڈ کے ایکٹرز کے دلدادہ، یوٹیوبرز، 8 مارچ کے دن بے لباسی کا مظاہرہ کرنے والے مرد وزن)
- جس نصابِ تعلیم سے فارغ ہوکر پاکستان کو انہیں خطوط پر چلا کر کامیاب کریں اور اسلام کا عادلانہ سماجی، معاشی اور سیاسی نظام عملاً قائم کرسکیں اور ایسی شاندار مثالیں قائم کریں کہ دنیا اس کو لینے کے لیے بے تاب ہوجائے۔ حتیٰ کہ یہ نظام دنیا از خود قبول کر کے اسلام کی تعلیمات کو عالمی حقیقت بنادیں۔

- یہی بات کہی تھی فرزند اقبال جناب جسٹس جاوید اقبال مرحوم نے دسمبر 1998ء میں طالبان افغانستان کی حکومت کا سرکاری مطالعاتی دورہ برائے نظام عدلیہ سے واپسی پر پشاور میں ___ جو اخبارات کی زینت بھی بنی تھی انہوں نے فرمایا کہ افغان طالبان نے اپنے ملک میں مختصر عرصے میں معاشی بدحالی اور تعلیم کی بالعموم کمی کے باوجود انسانی سماجی جرائم (از قسم چوری، ڈاکہ، قتل، زنا بالجبر، زنا بالرضا وغیرہ وغیرہ کا خاتمہ کردیا ہے اور امن کی مثالی کیفیت قائم کردی ہے یہ بات آگے بڑھے تو ساری دنیا کے ممالک از خود اس قانون کو نافذ کرنے کی خواہش کریں گے اور از خود مسلمان ہوجائیں گے۔

- افغان طالبان سے توقع ہے کہ وہ اپنے دورِ ثانی میں بھی اپنی اعلیٰ روایات کو قائم رکھیں گے۔ کاش ایسا ہوجائے کہ ہم اہل پاکستان بھی اپنے نظامِ تعلیم اور امریکی سرپرستی (امداد برائے تجدید تعلیم، تجدید برائے نظامِ عدل، تجدید برائے انسداد جرائم، امداد برائے تربیت تفتیشی و تحقیقی ادارے وغیرہ وغیرہ) سے زندہ باہر نکال کر آئینی تقاضوں کے مطابق اسلام کا نظام عدل قائم کرسکیں اور معیشت میں سود جیسے حرام کو یکسر ختم کر کے دنیا کو دکھا سکیں تو قیام پاکستان کے مقاصد کی تابنا کی اور انسان دوستی کی دنیا معترف ہوسکتی ہے۔ وما ذالك على الله بعزيزٍ

عصرِ حاضر کا مجاہدِ اعظم

مُلّا محمد عمرؒ جس نے ۱۳ سال تک تن تنہا جہاد کی قیادت کر کے وقت کے فرعون (امریکہ و نیٹو) کو شکست دی
ملا عمر کی فراست، للّٰہیت، کثرت ذکر و عبادت، مراقبہ اور توکّل علَی اللہ کے آنکھوں دیکھے حالات

(بشکریہ، ماہنامہ البرہان، لاہور اگست 2021ء)

ملا محمد عمر مجاہدؒ کی زندگی پر ایک تفصیلی کتاب حال ہی میں افغانستان کے ممتاز مصنف، شاعر، مؤرخ اور دانشور جناب عبدالستار سعید کے ہاتھوں تحریر ہو کر طبع ہو چکی ہے۔ یہ کتاب اس لحاظ سے ایک ممتاز، تاریخی اور مستند دستاویز ہے کہ اس میں ملا عمر کی زندگی سے متعلق تمام واقعات اور حالات ان کے قریبی ساتھیوں، اہل خانہ، بھائی، بیٹے، والدہ اور دیگر رشتہ داروں اور دوستوں سے براہ راست انٹرویو کر کے لکھے گئے ہیں۔ اور وہ لوگ جو مذکورہ حالات میں ان کے ساتھ اور شریک سفر رہے۔ اس کتاب نے ان کی زندگی کے متعلق بہت سے مغالطّوں کا خاتمہ کیا اور بہت سے حقائق سے پردہ اٹھایا ہے۔

ماہنامہ 'شریعت' نے ملا عمرؒ کی تاریخ وفات کی مناسبت سے شائع ہونے والے زیر نظر خصوصی شمارے میں مذکورہ کتاب کی ساتویں فصل کا پشتو سے ترجمہ کر کے اردو قارئین کی خدمت میں پیش کیا ہے جس میں ۲۰۰۱ء کے اواخر میں امارت اسلامیہ کے سقوط کے بعد ملا عمرؒ کی روپوشی کی زندگی اور امارت اسلامیہ کی تشکیل نو کی پوری تفصیل ذکر کی گئی ہے۔ لیکن اس سے پہلے ملا محمد عمرؒ کی اس تقریر سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے جو انہوں نے مارچ ۱۹۹۶ء میں قندھار میں اس چار روزہ اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کی جس میں انہیں امارت اسلامی افغانستان کا امیر المومنین چنا گیا۔ (مدیر البرہان)

تحریک طالبان کی ابتدا کیسے ہوئی؟ (ملا عمرؒ کی زبانی)

میں ایک چھوٹے مدرسے میں زیر تعلیم تھا۔ ہم تقریباً پندرہ بیس کے قریب کل طلباء اس مدرسے میں ایک ساتھ رہتے تھے۔ اس وقت ملک میں طوائف الملوکی، قتل وغارت، لوٹ مار اور آبروریزی کے واقعات عام تھے۔ زمین فساد سے بھر گئی تھی۔ کسی کو یہ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ ان برائیوں کا خاتمہ کس طرح کیا جائے۔ آپ نے وہ دور دیکھ لیا ہے، کسی کے وہم وگمان میں نہیں تھا کہ اصلاح کا راستہ کون سا ہے۔ اس لیے میرے لیے بھی قرآن کی یہ آیت کیا کافی نہیں تھی کہ ﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا﴾ کیونکہ میں بالکل بے بس تھا میں کیا کرسکتا تھا؟ لیکن میں نے یہاں توکّلِ محض کا فیصلہ کیا۔ یاد رکھو توکل محض کبھی ناکام نہیں ہوتا لیکن یہ بہت مشکل ہے۔ میں علما کو بھی توکل محض اختیار کرنے کا مشورہ دیتا ہوں۔

لوگ یہ سوال ضرور کریں گے کہ اس تحریک کی ابتداء کیسے ہوئی، اس کے پیچھے کیا محرکات تھے، کون اسے سپورٹ کررہا تھا، کس نے ان کی تربیت کی ذمہ داری اٹھانے کا وعدہ کیا تھا؟

اس تحریک کی ابتداء اسی چھوٹے مدرسے سے ہوئی جہاں میں زیر تعلیم تھا۔ میں نے یہاں پڑھائی معطل کرکے اپنے ایک دوست کے ساتھ اس تحریک کے آغاز کا فیصلہ کیا۔ سب سے پہلے ہم مدرسے سے پیدل نکلے اور سنگ حصار سے زنگاوات پہنچے [دونوں قندھار کے قصبے ہیں]۔ زنگاوات میں تالکان سے تعلق رکھنے والے سرور نامی شخص نے سفر کے لیے موٹر سائیکل فراہم کی اور ہم تالکان پہنچے۔ بس یہی اس تحریک کی ابتداء تھی۔ پھر میں نے اپنے ساتھی مولوی صاحب سے کہا کہ چلو قندھار کے چھوٹے مدارس اور مساجد کے حجروں میں مقیم طلبا کو اس تحریک میں شامل ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ صبح ہم نے ایک مدرسے سے آغاز کیا جہاں ۱۴ طلبا زیر تعلیم تھے۔ ہم نے انہیں اکٹھا کیا اور ان سے کہا کہ اللہ کے دین کی پامالی سرعام ہورہی ہے۔ ملک میں فسق وفجور اور قتل وغارت کا دور دورہ ہے، عام شاہراہ پر لوگوں کو قتل کرکے لاش کو پتھروں پر رکھ لیا جاتا ہے کسی کو لاش اٹھانے کی اجازت تک نہیں دی جاتی۔ برائیاں سرعام ہورہی ہیں جبکہ دین پر عمل چھپ کر کیا جارہا ہے۔ ان حالات میں پڑھائی نہیں ہوسکتی، اِعلاء کلمۃ اللہ کے لیے پڑھائی چھوڑنا بہتر ہے۔ اگر واقعی آپ طلبا دین کی خدمت کا جذبہ رکھتے ہو تو اُٹھو اور عملی قدم اٹھاؤ، کیونکہ یہ مسائل زندہ باد اور

مردہ باد سے حل ہونے والے نہیں ہیں۔ ہم نے انہیں یہ بھی بتایا کہ ہم سے کسی نے مالی اِمداد یا ہتھیار فراہم کرنے کا وعدہ نہیں کیا ہے۔ ہم انہی علاقوں میں دیندار عوام سے کھانا اور مالی مدد کا مطالبہ کریں گے۔ وہ دے دیں تو ٹھیک لیکن زبردستی کسی کے ساتھ نہیں کریں گے۔ اور ہاں! اس کے بعد پڑھائی کا نہیں سوچنا کیونکہ یہ ایک ہفتے، مہینے یا سال کا کام نہیں۔ کیا کوئی تیار ہے ہماری اس تحریک میں شامل ہونے کے لیے؟ میں ان کا حوصلہ بڑھانے کے لیے یہ بھی کہتا رہا کہ دیکھو ان مسلح جنگجوؤں کو جو باطل اور فاسق ہو کر بھی اس شدید گرمی میں اپنے مورچوں میں بیٹھے ہوئے ہیں لیکن ہم اللہ کے دین کے لیے کیوں کچھ مشقت برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے؟ ہم کیوں اللہ کے دین پر عمل علانیہ نہیں کر سکتے۔ اتنی غفلت اچھی نہیں ہے۔

جب میں نے انہیں یہ بتایا کہ اسلحہ نہیں، کھانے کا انتظام نہیں، کسی سے مالی امداد ملنے کی توقع نہیں تو اللہ کی قسم ان ۱۴ طلبا میں کسی نے بھی ہمارے ساتھ جانے کی حامی نہیں بھری۔ سب نے انکار کیا۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ اگر صرف جمعے کو کوئی کام ہو تو میں حاضر ہوں۔ میں نے کہا کہ جمعہ کے بعد کون کرے گا؟ اللہ شاہد ہے کہ واقعہ اسی طرح ہے اور روزِ محشر اللہ کے حضور بھی یہی گواہی دوں گا۔

اگر میں اس مدرسے کو دوسرے مدارس پر قیاس کرتا تو میں واپس اپنے مدرسے آجاتا لیکن یہ توکل محض کا نتیجہ تھا کہ میں نے ہار نہیں مانی۔ میں نے اللہ کے ساتھ جو وعدہ کیا تھا اس پر وفا کی اور اللہ نے مجھے سرخرو کیا۔ خیر اس کے بعد ہم ایک اور حجرے (حجرہ، مسجد سے متصل کمرہ جہاں افغانستان میں طلبا کی رہائش ہوتی ہے اس کی حیثیت ایک چھوٹے سے مدرسے کی ہوتی ہے) کی طرف چل پڑے جہاں ۵ یا ۷ طلبا تھے۔ ان کو بھی ہم نے اسی طرح سخت شرائط بتائیں لیکن ان تمام سات طلبا نے اپنے نام لکھوا دیے۔ اب دیکھیں کہ دونوں مدارس تھے۔ ایک علاقے، ایک زبان اور الحمدللہ ایک امت تھے، ایسا نہیں تھا کہ اول الذکر بچے تھے اور آخر الذکر جوان، یا وہ جوان تھے اور یہ بوڑھے، یا وہ مرد تھے اور یہ خواتین۔ ایک جماعت کا مکمل طور پر انکار کرنا اور ایک کا مکمل طور پر ساتھ دینا، یہ ابتداء ہی میں میرے لیے ایک امتحان تھا۔ یہی ابتداء تھی اس تحریک کی۔

مختصر یہ کہ عصر تک ہم اسی موٹر سائیکل پر طلبا کو دعوت دیتے رہے۔ اس طرح کل ۵۳ افراد نے ہمارے پاس اپنے نام لکھوا دیے۔ تو کل محض کے نتیجے میں ۵۳ افراد تیار ہوئے جن

کو میں نے ہدایت کی کہ آپ سب کل سنگ حصار آجائیں لیکن وہ رات کو تقریباً ایک بجے کے قریب ہی سنگ حصار پہنچ گئے۔ یہی تحریک کی ابتدا تھی۔ صبح ہی ہمارے ایک ساتھی مولوی صاحب امامت کے لیے فجر کی نماز پڑھانے گئے۔ نماز کے بعد ان کے مقتدی نے مولوی صاحب کو اپنا خواب سنایا کہ میں نے خواب دیکھا کہ ہمارے علاقے سنگ حصار میں فرشتے تشریف لائے ہیں۔ صبح ۱۰ بجے حاجی بشیر نے ہمیں دو گاڑیاں دیں، جس میں ہم میوند کے علاقے کشت نخود گئے۔ یہاں بہت سے لوگ ہمارے ساتھ شامل ہوئے۔ اس کے بعد ہم نے کہیں سے تین اور کہیں سے پانچ کلاشنکوف لوگوں سے خریدیں اور کہیں کوئی ساتھی مفت میں اسلحہ دینے پر آمادہ ہو جاتا۔ یہاں ہماری تعداد بھی بڑھتی گئی اور تحریک کا باقاعدہ آغاز ہوا۔

صلیبی جارحیت کے خلاف جہاد کا تسلسل

امریکی جارحیت کے آغاز سے ہی ملا عمرؒ کا خیال تھا کہ اگر بالفرض براہِ راست جنگ میں طالبان شکست کھا جائیں تو امریکی جارحیت پسندوں کے خلاف بھی سوویت یونین کی طرح گوریلا جنگ شروع کی جائے گی، تاکہ امریکا ایک طویل جنگ میں گر کر تھک ہار کر شکست کھا جائے۔

جارحیت کے آغاز سے چند دن قبل ۲۷ ستمبر ۲۰۰۱ء کو امیر المومنین مرحوم نے ریڈیو صدائے شریعت پر ایک طویل خطاب کیا۔ اس خطاب میں ایک جگہ فرمایا: ''اے امریکا اور اس کے حامیو! تم کتنے خام خیال لوگ ہو۔ طالبان کی حکومت کوئی ایسی حکومت تو نہیں جس طرح ظاہر شاہ کی تھی۔ ظاہر شاہ روم کے دورے پر گیا تو پیچھے سے عسکری نظام نے بغاوت کر دی۔ اس کی ساری فوج نے نئے نظام کو تسلیم کر لیا اور ہتھیار ڈال دیے۔ طالبان کا نظام تو منظّم جہادی گروپوں پر مشتمل ہے۔ منظّم محاذ ہیں۔ بظاہر چلو یہ نظام سقوط کر جائے، لیکن یہ محاذ پھر سے دیہی علاقوں اور پہاڑوں کی طرف عقب نشینی کر کے پھر سے منظّم ہو جائیں گے۔ پھر تمہاری کیا حالت ہوگی؟ پھر وہی کمیونسٹوں کی حکومت والے حالات ہوں گے۔ پھر تم کیسے حکومت کر سکو گے؟ تمہاری فوج کون سی ہوگی؟ اگر تمہاری طرف سے امریکی لڑیں گے تو کمیونسٹوں کے ساتھ روسی فوج تھی پھر وہ کہاں چلے گئے؟ تم کیسے اپنا دفاع کر سکو گے؟ اب بھی خوب سوچ لو، خود کو تباہ نہ کرو، خود کو غرق نہ کرو، یہ مسلمانوں کا ملک ہے۔ افغانستان مسلمانوں کا ٹھکانہ ہے۔ اس پر اللہ کی خاص نظر ہے''۔

امیر المومنینؒ کے اس خطاب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان معاصر سیاسی رہنماؤں کی طرح نہیں تھے کہ حکومت کے خاتمے کے بعد میدان چھوڑ کر کسی اور ملک میں سیاسی پناہ لے لیں گے۔ اسی طرح اس جانب بھی اشارہ تھا کہ امریکی یہ نہ سوچیں کہ طالبان کی حکومت کے خاتمے اور بڑے شہروں پر ان کے قبضے سے سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ بلکہ طالبان شہروں سے عقب نشینی کر کے دیہی علاقوں اور پہاڑوں پر چلے جائیں گے اور پھر پہاڑوں سے بیرونی جارحیت پسندوں اور ان کے مقامی ہمنواؤں کے خلاف ناقابل شکست مزاحمت کا آغاز کریں گے۔

قندھار شہر پر قبضے کے بعد امریکا کا خیال تھا کہ اب افغانستان کا قضیہ نمٹ چکا ہے اور جنگ ختم ہو چکی ہے۔ اسی لیے تو امریکی وزیر دفاع ڈونلڈ رمز فیلڈ نے اپنے پہلے دورۂ افغانستان میں اپنے فوجی آپریشن کی کامیابی کا اعلان کر دیا۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ انہیں استعمار کے قبرستان کی مزاحمتی خاصیت کا پورا ادراک نہیں تھا، اس لیے وقت سے پہلے ہی کامیابی کا اعلان کر دیا۔

اب اس بات کا امریکی عسکری ماہرین بھی اعتراف کرتے ہیں کہ اس وقت امریکی حکام نے افغانستان کے حالات کا صحیح ادراک نہیں کیا تھا۔ عسکری امور کے امریکی ماہر ڈیوڈ کال کلین جنہوں نے ''جدید گوریلا جنگیں'' کے نام سے کتاب بھی لکھی ہے جو ۲۰۰۹ء میں شائع ہوئی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں: ''ہمارے رہنماؤں کو چاہیے تھا کہ طالبان کے سقوط کے بعد کے حالات میں سابق برطانوی جنرل کیرو (Sir Olf Caroe) کی وہ بات یاد رکھتے، جو افغانستان میں جنگ اور شکست کے تجربات کی روشنی میں اس نے کہی ہے کہ'' دیگر خطوں میں جنگ کے برخلاف افغانستان میں حقیقی جنگ اس وقت شروع ہوتی ہے جب تمہیں جنگ جیت جانے کا یقین ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ افغانستان میں داخل ہونا اور شہروں پر قبضہ کرنا تو آسان ہوتا ہے مگر پورے ملک پر قبضہ بہت مشکل ہے''۔ ڈیوڈ کلین کا کہنا ہے کہ مغربی قوتوں کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ انہوں نے افغانستان میں داخل ہونے کو ہی اپنی کامیابی سمجھ لیا۔ حالانکہ اصل جنگ اس کے بعد ہی شروع ہونے والی تھی۔

امریکی جارحیت پسندوں کے خلاف دو ماہ براہِ راست جنگ اور مورچہ بند مزاحمت واقعتاً ایک طویل جنگ کا آغاز تھا۔ امیر المومنینؒ امریکا سے براہِ راست جنگ اور زندگی کی آخری

سانسوں تک لڑنے کی تاکید کررہے تھے اور ساتھ ہی امریکی جارحیت کے خلاف طویل جنگ کی تیاری بھی کررہے تھے۔ اسی لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ قندھار چھوڑ کر زابل میں امیر المومنین کی روپوشی دراصل روپوشی نہیں گھات لگانے کی تیاری تھی۔ قندھار چھوڑنے سے قبل ان کی گفتگو اور کچھ اقدامات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

امیر المومنین کے قریبی ساتھی ملا گل آغا آخند کہتے ہیں: طالبان جب قندھار اور اس کے مضافات کے علاقے خالی کر کے جانے لگے تو کچھ طالبان رہنماؤں کا خیال تھا اور انہوں نے امیر المومنین کو اس کا مشورہ بھی دیا کہ یہ صوبہ قندھار ان سابقہ جہادی کمانڈروں کے حوالے کر کے جائیں جو طالبان سے کسی حد تک ہمدردی اور قربت رکھتے تھے اور عوام میں بھی ان کی کچھ نہ کچھ مقبولیت تھی جیسے حاجی بشیر، ملا نقیب اور جلدک کے ملا عبدالکریم وغیرہ۔ مگر امیر المومنین نے جواب دیا کہ اوّل تو میں کوئی بھی علاقہ (رسمی طور پر) کسی کو حوالے کر کے نہیں جاؤں گا۔ پھر اگر مصلحت کی خاطر ہم کوئی شہر چھوڑ کر جارہے ہیں تو ہمارے بعد کوئی ایسا شخص نہ آئے جو عام لوگوں کو ساتھ ملا کر امریکی جارحیت اور حاکمیّت پر انہیں قائل کرے، انہیں جارحیت کو تسلیم کرنے پر آمادہ کرے۔ ہم امریکا کے خلاف جہاد کریں گے اور اس جہاد میں ہمیں عوام کی حمایت کی ضرورت ہوگی۔ تو حکومت ایسے لوگوں کے حوالے نہ کرو جو کل کو عوام کے لیے دلیل بن جائیں اور ان کی وجہ سے کل کو سب لوگ گمراہ ہو کر کفار کے ساتھی بن جائیں۔

ملا گل آغا کا کہنا ہے کہ امیر المومنینؒ نے آخری دنوں میں مجھے حکم دیا کہ امارت کے بجٹ میں ڈھائی ملین ڈالر کی رقم موجود ہے۔ یہ رقم امارت اسلامیہ کے رہنماؤں اور عسکری کمانڈروں میں اس پیغام کے ساتھ تقسیم کرو کہ یہ رقم تمہارے ذاتی استعمال کے لیے نہیں بلکہ اس سے اپنے اپنے علاقوں میں جہادی امور کا بندوبست کرتے رہو۔ مجاہدین کی مدد اور وسائل کا انتظام کرو، جب تک ہمارا دوبارہ رابطہ بحال ہو اور منظّم کام شروع ہو۔ ان تمام امور سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر المومنین جارحیت پسندوں کے خلاف جہاد کے اجرا کا یقینی فیصلہ کر چکے تھے اور اس کے لیے انہوں نے زابل کو اپنے خفیہ مورچہ کے طور پر منتخب کیا تھا۔

قندھار شہر سے سورغر کے دامن تک

۵ دسمبر ۲۰۰۱ء، بیس رمضان المبارک کی دوپہر کو امیر المومنین اپنے دو ساتھیوں ملا عزیز اللہ

اور ملاعبدالباری کے ساتھ ایک جےٹورین (سراچہ) کار میں قندھار شہر سے قندھار۔کابل شاہراہ پر نکل پڑے اور اسی دن شام کو ضلعی سیوری کے گاؤں عمرزو پہنچے۔ یہ ضلع صوبہ زابل کے مرکز کلات کے جنوب میں واقع ہے۔سورغر کے مشہور پہاڑ کے شمالی جانب مشرق سے مغرب تک یہ آبادی پھیلی ہوئی ہے۔ یہ ضلع امارت اسلامیہ کی حکومت سے قبل قریبی ضلع شینکی کا حصہ سمجھا جاتا تھا۔امارت اسلامیہ نے اپنے دورِحکومت میں اسے الگ ضلع کا درجہ دیا۔اس کی آبادی بہت کم ہے۔ یہاں کے لوگوں کا ذریعہ معاش انگور اور بادام کے باغات ہیں۔امیر المومنین نے قندھار چھوڑنے کے بعد بقیہ ساری زندگی اسی ضلع میں گزاری۔ذیل میں اس کی تفصیلات پر روشنی ڈالیں گے۔

زابل ضلع سیوری میں پہلا مشاورتی اِجلاس

ضلع سیوری پہنچنے کے بعد امیر المومنین نے ملاعبدالجبار عمری کو حکم دیا کہ زابل صوبہ کے تمام ممتاز مجاہدین اور گروپ کمانڈروں کو جمع کرے۔اس اجلاس میں زابل کے اکثر مجاہدین رہنما شریک ہوئے۔اس مشاورتی اجلاس کے آخر میں ملامحمد عمر مجاہد نے مجاہدین کو مستقبل کے متعلق ضروری ہدایات دیں۔اس وقت تک طالبان نے صوبہ زابل خالی نہیں کیا تھا بلکہ انخلا کی تیاری میں تھے۔امیر المومنین نے زابل کے مجاہدین سے یہ بھی کہا کہ یہاں کمانڈر حمیداللہ کی حاکمیّت کا راستہ روکو۔حمیداللہ ایک جنگجو کمانڈر تھا جو حامد کرزئی کا ساتھی تھا۔امریکا نے طالبان کے بعد صوبہ زابل پر قبضے اور اقتدار کے لیے اسے چن لیا تھا۔ یہ شخص قندھار سے زابل کے ضلع ارغنداب پہنچ چکا تھا اور چاہتا تھا کہ مرکز کلات پر قبضہ کرے۔

شینکئی روانگی

ضلع سیوری کے اس پہلے مقام پر چند دن ٹھہرنے کے بعد وہ اسی گاؤں میں واقع اپنے دوست عمری صاحب کے ایک دوست عبدالحمید آغا کے گھر پہنچے۔عبدالحمید آغا کے گھر کے افراد کہیں اور چلے گئے تھے اس لیے یہ مکان خالی پڑا تھا جہاں وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ چند دن رہے۔پھر یہاں سے زابل کے ضلع شینکئی گئے جہاں اپنے بہنوئی مولوی عبدالرحمٰن صاحب کے گھر میں رہنے لگے۔ یہ امیر المومنین کی ماں شریک بہن کا گھر تھا۔کچھ دن یہاں گزارنے کے بعد شینکئی ہی میں مشہور عالم مولوی محمد اکرم صاحب کے گھر منتقل ہوگئے اور چند دن یہیں قیام کیا۔اس دوران جب

ان کا قیام ضلع شینکئی میں تھا انہوں نے اپنے کچھ عسکری ذمہ داران کا اجلاس بھی بلایا۔ اس اجلاس میں بھی جہاد کے تسلسل اور اجرا پر گفتگو ہوئی۔ قندھار میں امارت اسلامیہ کے دور حکومت میں مالیات کے انتظامی مسئول ملا عبدالباری جو اس اجلاس میں شریک تھے، انہوں نے بتایا کہ یہ اجلاس رات کو منعقد ہوا۔ اجلاس میں شریک ہونے کے لیے ہم اس گھر پہنچے جہاں امیر المومنین کا قیام تھا۔ برآمدے میں گیس سلینڈر سے روشنی کا انتظام کیا گیا تھا جس کی روشنی میں اجلاس جاری تھا۔ بات اس پر ہو رہی تھی کہ اب کیا، کیا جائے اور جہادی کارروائیوں کو تسلسل کیسے بخشا جائے؟

کچھ ساتھیوں کا کہنا تھا کہ کچھ عرصہ انتظار کر لیتے ہیں، امریکی بہت جوش میں ہیں، بعد میں کارروائیوں کا آغاز کریں گے مگر ملا صاحب کا کہنا تھا کہ نہیں ہر شخص اپنے اپنے علاقے میں کام شروع کر دے۔ اجلاس کے اختتام پر انہوں نے ملا عبدالرزاق نافذ سے کہا کہ اپنے اصل علاقے اروزگان نہ جائے بلکہ یہیں ان کے آس پاس قیام کرے۔ اسی لیے ملا عبدالرزاق نافذ نے کافی عرصہ وہیں قیام کیا۔ مگر جب سیکورٹی خدشات کی بنا پر امیر المومنینؒ نے تنہا زندگی اختیار کر لی اور صرف ایک مخصوص قاصد کے ذریعے مجاہدین سے رابطوں کا سلسلہ شروع کیا تو ملا عبدالرزاق بھی زابل چھوڑ کر اپنے علاقے اروزگان چلے گئے۔

امیر المومنین نے رمضان کے آخری ایام اور عید الفطر شینکئی ہی میں گزارے۔ یہ ایسا وقت تھا جب پورے ملک میں امریکا کی فوجی کارروائیاں، پروپیگنڈا اور نفسیاتی جنگ بہت شدت سے جاری تھی۔ ریڈیو چینلز پر امریکا کی کامیابیوں اور امارت اسلامیہ کے رہنماؤں کی گرفتاریوں اور شہادتوں کی خبریں مسلسل آ رہی تھیں۔ زابل ہی کے ایک سابق جہادی کمانڈر نور اللہ نے امیر المومنین کو مشورہ دیا کہ وہ پاکستان چلے جائیں اور اس کے لیے وہ پوری طرح سے تعاون کرنے کو تیار ہیں۔ مگر امیر المومنین نے پاکستان جانے کا مشورہ مسترد کر دیا اور کہا میں یہیں پر رہنا زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔

ضلع سیوری کی طرف واپسی

امیر المومنین اور ان کے دو ساتھیوں ملا عزیز اللہ اور ملا عبدالباری جو پچیس رمضان کو شینکئی گئے تھے، عید کے چوتھے روز ۱۹ دسمبر ۲۰۰۱ء کو ملا عبدالجبار عمری کی رہنمائی میں واپس ضلع سیوری لوٹ آئے۔ یہاں انہوں نے ابتدا میں خورچ نامی ایک گاؤں میں ملا عبدالکبیر اخوند کے

گھر میں ۱۸ دن گزارے۔ پھر اسی ضلع میں ایک دوسرے گاؤں خوڑی منتقل ہو گئے۔ یہاں ایک اور مجاہد استاد عبدالصمد کے گھر میں رہائش اختیار کی۔ ضلع سیوری میں یہ وہی گھر ہے جہاں امیر المومنین ۶ جنوری ۲۰۰۲ء سے ۲۰۰۷ء تک رہائش پذیر رہے۔ یہاں ہم اس گھر کا امیر المومنین کی پہلی رہائش گاہ کے طور پر ذکر کریں گے۔

پہلی جائے رہائش

اس گھر میں امیر المومنینؒ اور ان کے ساتھی ملا عزیز اللہ اخند، ملا عبدالباری اخند اور ملا عبدالجبار عمری نے رہائش اختیار کی۔ یہ لوگ گھر کے ایک طرف بنے کمروں میں رہنے لگے، جن کے دروازے پر ہمیشہ باہر سے تالا پڑا رہتا تا کہ گھر آنے جانے والے پڑوسیوں کو شک نہ پڑے کہ یہاں بھی کوئی ہے۔ ابتدائی دن یہاں سردی کے دن تھے اس لیے یہاں انگیٹھی جلانے کی ضرورت پڑتی مگر دن کو اس لیے یہاں انگیٹھی نہیں جلائی جاتی تھی تا کہ چھت سے نکلنے والا دھواں دیکھ کر پڑوسی شک نہ کرنے لگیں کہ اس خالی کمرے کی چمنی سے دھواں کیسے اُٹھ رہا ہے؟ گھر میں اگر کوئی مہمان آجاتا تو بلند آواز سے بات کرنے سے بھی احتراز کیا جاتا۔ سردیوں کے اختتام اور بہار کی آمد پر ان کے ساتھی عبدالجبار عمری صاحب ان کی اجازت سے چلے گئے اور دو ساتھی ملا عزیز اللہ اور ملا عبدالباری امیر المومنینؒ کے پاس رہ گئے۔

عمری صاحب کا کہنا ہے کہ جب تک میں ان کے ساتھ تھا تو سالن وغیرہ ہم خود بنا لیتے تھے۔ تیار روٹی اور سالن کے لیے ضروری چیزیں اہل خانہ فراہم کر دیتے جو ہم اسی کمرے میں تیار کرتے۔ ملا عمرؒ کا مزاج ایسا تھا کہ وہ دوستوں کے درمیان کوئی امتیازی شان پسند نہیں کرتے تھے۔

اسی گھر کے ایک فرد اور امیر المومنین کے میزبان حاجی عبدالاحد نے بتایا: امریکی جارحیت کے ابتدائی دنوں میں ملا عبدالجبار عمری ہمارے گھر آئے۔ میرے بڑے بھائی سے کہا کہ امیر المومنین کی سیکورٹی کے لیے مجھ سے تعاون کرو۔ ہم نے رضا مندی ظاہر کی۔ اگلی رات امیر المومنینؒ، ملا عبدالجبار عمری، ملا عزیز اللہ اور ملا عبدالباری ہمارے گھر آ گئے اور مستقل رہائش اختیار کر لی۔ کئی ماہ تک ان کے ساتھی بھی ان کے ساتھ رہے۔ ہم نے انہیں کتابیں لا کر دیں۔ وہ سب ہر وقت مطالعہ میں مصروف رہتے۔ کچھ عرصہ بعد ان میں سے ایک دوست چلے گئے۔ ان کے

دوساتھی دوسال تک ان کے ساتھ یہیں رہے۔ بعد میں امیر المومنین نے ان دوکو بھی رخصت کر دیا اور اکیلے رہنے لگے۔ آپؒ تلاوت زیادہ کرتے اور اکثر وقت کتابوں کے مطالعے میں صرف کرتے۔ ریڈیو سنتے۔ سر گھٹنوں پر رکھ کر بہت دیر تک مراقبے میں مصروف رہتے۔ کبھی ہم گھر کے چھوٹے گود میں کھیلنے والے بچے لے کر ان کے پاس جاتے، جن سے کھیل کر وہ دل لگی کرتے۔

امیر المومنین کو ہم نے ملا عبداللہ اخند کا نام دیا تھا۔ پہلے ہم نے گھر کے ایک حصے میں انہیں دو کمرے دیے تھے جن کے دروازے آمنے سامنے کھلتے تھے اور ان کے درمیان بند کوریڈور تھا جس کے دروازے کو ہم نے باہر سے تالا لگایا ہوا تھا۔ بظاہر کسی کو شک نہیں ہوتا تھا کہ یہاں کوئی ہوگا۔ ہمارے گھر میں کسی کا آنا جانا کم ہو، اس کے لیے ہم نے اپنے رشتہ داروں حتیٰ کہ اپنے بھائیوں سے بھی تعلقات کم کر لیے تھے۔ صرف گھر کے بڑے مرد اور خواتین کو خبر تھی۔ ہماری ماں، جس کا اب انتقال ہو چکا ہے، انہوں نے اس میں بہت تعاون کیا۔ بہت مہارت سے یہ راز چھپائے رکھا۔ بعد میں ہم نے باغ میں مکان بنوایا اور وہاں منتقل ہو گئے۔ مگر وہاں مسئلہ یہ پیش آیا کہ یہ نیا مکان گاؤں کی آبادی سے کچھ فاصلے پر تھا۔ جب امریکی فوجیوں کا چھاپہ پڑتا تو ان کی گاڑیاں اور ہیلی کاپٹر ہمارے گھر کے قریب آ کر رُک جاتے۔ اس لیے ہم واپس اپنے پرانے مکان منتقل ہو گئے اور امیر المومنین کی حفاظت کے لیے ایک نئی ترکیب بنائی۔

گھر کے ایک کونے میں دیگر کمروں کے تسلسل میں بیچ میں ایک ایسا کمرہ بنایا جس کے متعلق کسی انجان آدمی کو بآسانی معلوم نہیں ہوسکتا تھا کہ یہاں بھی کوئی کمرہ ہوگا۔ اس کمرے کا دروازہ صرف برابر والے کمرے سے کھلتا تھا۔ اور وہ دروازہ ایسا بنایا گیا تھا کہ بظاہر دیوار میں چنی ہوئی الماری لگتا تھا۔ اس الماری نما دروازے سے امیر المومنین کے خاص کمرے میں آنا جانا ہوتا تھا۔

امیر المومنین ملا محمد عمر مجاہد نے امریکی جارحیت کے بعد روپوشی کی زندگی اختیار کر لی تھی۔ اسے کوئی ان کا خوف نہ سمجھے کیونکہ وہ امریکا سے چھپے نہیں بلکہ گھات لگائے ہوئے تھے یعنی وہ جانتے تھے کہ امریکا کے پاس عسکری لحاظ سے وسائل بہت زیادہ ہیں اور آمنے سامنے جنگ میں وہ طاقتور ہوگا۔ جس طرح عام مجاہدین نے محاذوں کی کھلی جنگ کی جگہ گوریلا کارروائیاں شروع کیں اور گروپ بند حملوں کی جگہ خفیہ کارروائیوں کا آغاز کیا تو امیر المومنینؒ نے بھی علانیہ کی بجائے

مخفی رہ کر متحرک رہنے کا فیصلہ کیا تا کہ امریکا کو ایک طویل اور حوصلہ شکن جنگ میں گھیر لیا جائے۔

ایسی مصلحتوں کی خاطر خود کو روپوش کرنا پیغمبروں کی سنت اور امت کے اکابر کا طریقہ رہا ہے۔ جس طرح رسول اکرم ﷺ جب مکہ مکرمہ سے ہجرت کے وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ کچھ راتیں غار ثور میں رہے کیونکہ کفار نے آپ ﷺ کے سر کی قیمت سو اونٹ مقرر کی تھی۔ مشرکین آپ ﷺ کے پیچھے یہاں تک آئے کہ غار ثور کے دہانے پر کھڑے ہو گئے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ آنحضرت ﷺ سے فرمانے لگے کہ اگر یہ لوگ اپنے قدموں میں دیکھیں تو ہمیں دیکھ لیں گے۔ آنحضرت ﷺ کو اللہ کی ذات پر کامل یقین تھا اس لیے فرمایا کہ تمہیں کیوں فکر ہے ان دو لوگوں کے متعلق جن کا تیسرا اللہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت کریں گے۔ ایسا ہی ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم ﷺ اور ان کے ساتھی حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اسی اخفا اور احتیاطی تدبیر کی بنا پر نجات دی۔ واقعہ یہ ہے کہ امیر المومنینؒ کی حفاظت بھی اللہ تعالیٰ کا خاص فضل اور اس عظیم مجاہد کی واضح کرامت تھی۔ کیونکہ وہ ایسے علاقے میں رہ رہے تھے جہاں امریکی فوجیوں کا بار بار چھاپہ پڑتا تھا۔ ان کی حفاظتی تدابیر بھی بہت معمولی تھیں اور صرف اس میزبان کی ذاتی ذہانت اور ایجاد کا کرشمہ تھیں جہاں امیر المومنینؒ رہتے تھے۔ امریکی کئی بار ان کی جائے رہائش کے قریب آئے مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل سے امریکیوں کے شر اور اذیت سے ان کی حفاظت فرمائی۔

''میں اپنی فہم کا مکلّف ہوں''

امریکی جارحیت کے ابتدائی سال امریکا کے عسکری دباؤ اور انٹیلی جنس تلاشیوں کے حوالے سے بہت حساس تھے۔ امریکا جو عسکری جارحیت اور کامیابی کے نشے میں تھا افغانستان کے تمام شہروں اور دیہاتوں حتیٰ کہ پہاڑوں اور صحراؤں میں بھی گشت اور سرچ آپریشن کرتا رہا۔ دوسری جانب امارتِ اسلامیہ کے مجاہدین اور خاص طور پر ملا عمر مجاہد کی گرفتاری پر بھاری انعام بھی مقرر کیا گیا تھا۔ ان کی تلاش کے لیے دیہاتوں میں ہیلی کاپٹروں سے پمفلٹ بھی گرائے جاتے۔ ایسے حالات میں اور ان ابتدائی سالوں میں افغانستان کے اندر رہنا وہ بھی ایسے انتہائی مطلوب ترین شخص کے لیے، خطروں سے خالی نہ تھا۔ ان سب کے باوجود امیر المومنین زابل جیسے صوبے میں ساری زندگی رہے۔ زابل وہ صوبہ ہے جہاں ملک کے دوسرے علاقوں کی بنسبت سب سے

پہلے امریکا کے خلاف جہاد اور عسکری کارروائیوں کا آغاز ہو گیا تھا جس سے امریکیوں کی ساری توجہ اسی علاقے پر مرکوز ہو گئی تھی۔

ان کے ساتھی اور قاصد ملا عزیز اللہ اخند جو اس دوران پہلے ان کے ساتھی رہے پھر قاصد کے طور پر ان سے اکثر ملتے رہے، ان کا کہنا ہے کہ ہم امیر المومنین سے کہتے کہ اس علاقے میں رہائش آپ کے لیے خطرناک ہے۔ اسی طرح لوگوں میں یہ باتیں پھیلنے لگی تھیں کہ امریکی فوجیوں کے پاس کھوجی کتے ہیں جس سے تلاشی کے دوران وہ لوگوں کو ڈھونڈتے ہیں۔ ایسی باتیں سن کر ہمیں امیر المومنین کی حفاظت کی فکر لاحق ہو جاتی۔ مگر جب یہ باتیں ہم ان سے کہتے تو وہ فرماتے مجھ سے ایسی باتیں نہ کرو۔ میں (اللہ کی طرف سے) اپنی فہم اور اپنی تدبیر کا مکلّف ہوں۔ مجھے میری فہم کہتی ہے کہ میں یہیں افغانستان میں زیادہ پر امن ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہی میری حفاظت فرمائیں گے۔ میں تمہاری فہم کا مکلّف نہیں ہوں۔

امیر المومنین کا جذبہ توکل انتہائی بلند تھا۔ انتہائی سخت حالات میں بھی ان کے چہرے پر گھبراہٹ اور پریشانی کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ اللہ تعالیٰ پر ان کا کامل یقین تھا کہ وہ ان کی حفاظت فرمائیں گے۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی قسم کھا کر کہتے کہ امریکی اور ان کے کٹھ پتلی مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ ان کا توکل اس وقت کسی کے لیے قابل فہم نہ ہوتا۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی ایسی ہی حفاظت فرمائی جس طرح ان کا اللہ پر یقین تھا۔

امریکیوں کی تلاشی

اسی خاندان کے ایک فرد حاجی عبدالاحد نے بتایا کہ امیر المومنین جب تک ہمارے گھر میں رہے ہمارے گاؤں پر چار بار امریکی فوجیوں کا چھاپہ پڑا مگر ہر بار اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت فرمائی۔ ایک دن صبح سویرے جب ہم نماز کے لیے جاگے تو کیا دیکھا کہ سارا گاؤں امریکی فوجیوں سے بھرا پڑا ہے۔ ہمارے گھر میں لکڑیوں کا ایک بڑا ڈھیر لگا ہوا تھا جس کا درمیانی حصہ ہم نے خالی رکھا تھا اور ضرورت پڑنے پر آدمی اس میں داخل ہو سکتا تھا۔ امیر المومنین نے احتیاطاً اپنے ساتھیوں سمیت اس میں پناہ لے لی۔ امریکی فوجیوں نے کچھ گھروں کی تلاشی لی اور چلے گئے۔ تلاشی ہمارے گھر تک نہ پہنچ سکی۔

دوسری بار شام کا وقت تھا جب امریکی فوجی آئے۔ ہم گھر پر موجود نہیں تھے۔ ہماری والدہ جو ہماری غیر موجودگی میں گھر کی سرپرستی کرتی تھیں وہ بھی اس وقت گھر سے نکل کر کسی پڑوسی کے گھر گئی تھیں۔ انہیں جب امریکیوں کی آمد کی اطلاع ملی تو دوڑتی ہوئی اپنے گھر آئیں۔ گاؤں میں جگہ جگہ اور ہمارے گھر کے سامنے ان کی بکتر بند گاڑیاں کھڑی تھیں۔ کچھ دیر ان کا گشت رہا اور پھر چلے گئے۔ امیر المومنین کو ان کی آمد کا پتہ ہی نہ چلا۔

ایک دفعہ دوپہر کا وقت تھا جب امریکی فوجی ہمارے گاؤں آئے۔ پورے گاوں میں تلاشی کا سلسلہ شروع کر دیا۔ امیر المومنین اپنے خفیہ کمرے میں تھے۔ امریکی فوجی ہمارے گھر میں داخل ہوئے۔ گھر کے تمام کمرے چیک کیے۔ کھوجی کتے بھی ان کے ساتھ تھے۔ خاص اس جگہ بھی پہنچے جہاں سے الماری نما دروازے سے امیر المومنین کے کمرے کی طرف دروازہ کھلتا تھا مگر وہ سمجھ نہیں سکے اور نہ ان کے کتوں کو اس کا احساس ہو سکا۔ امریکی واپس چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ہم ملا صاحب سے ملے، وہ اطمینان سے بیٹھے تھے اور کہہ رہے تھے: بے فکر رہو، ہماری حفاظت اللہ کرے گا۔

ایک دن صبح سویرے پھو پھٹنے کا وقت تھا جب ہیلی کاپٹر گاؤں میں اترے۔ ہمارے گھر کے قریب ندی کے پاس بھی تین چینوک ہیلی کاپٹر زلینڈ کر گئے۔ گاؤں کے بالائی گھروں سے گھر گھر تلاشی شروع ہوگئی۔ جو لوگ فجر کی نماز پڑھنے گھر سے نکلے تھے سب کو باہر ہی بٹھا دیا۔ ہم مسجد کی طرف نکلے نہیں تھے اس لیے گھر ہی میں پھنس کر رہ گئے۔ اس وقت تلاشی ہمارے گھر کے انتہائی قریب پہنچ چکی تھی۔ تلاشی لینے والے اہلکاروں سے قبل دو خواتین امریکی فوجی اور ایک ترجمان خاتون ہمارے دروازے کی طرف آ گئیں۔ پھر گھر کی دہلیز کے اندر آ گئیں اور ہمارے گھر کی خواتین سے گفتگو کرنے لگیں، وہ پوچھنے لگیں کہ یہاں طالبان تو نہیں ہیں؟ ہمارے گھر کی خواتین نے کہا نہیں۔ ان کی گفتگو جاری رہی۔ بعد میں جب تلاشی کا سلسلہ ہمارے گھر تک پہنچا تو انہی خواتین اہلکاروں نے جا کر اپنے فوجیوں سے کہا کہ یہاں ہم دیکھ چکیں یہاں کوئی نہیں ہے۔ اس طرح تلاشی کا یہ سلسلہ ہمارے گھر سے آگے بڑھ گیا۔

حاجی عبدالاحد کہتے ہیں کہ امیر المومنین اگرچہ پوری احتیاط کرتے کہ دشمن سے کسی

طرح سامنا نہ ہو، مگر اپنے کمرے میں اسلحہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے۔ ایک کیوبن شارٹ گن، ایک کلاشنکوف اور ایک بیس بور کا میگا روف پستول بے شمار گولیوں کے ساتھ ہر وقت اپنے پاس رکھتے کہ اگر ممکنہ طور پر امریکی انہیں ڈھونڈ لیتے تو امیر المومنین آخری سانس تک ان سے لڑتے اور زندہ خود کو ان کے حوالے نہ کرتے۔

روپوشی کی زندگی میں امیر المومنین کی روزمرہ مصروفیات

ملا عبدالجبار عمری جو امیر المومنین کی ۱۳ سالہ روپوشی کی زندگی میں اکثر وقت ان کے ساتھ رہے اور ان کی خدمت کی۔ ان کا کہنا ہے کہ امیر المومنینؒ فجر کی نماز کی ادائی کے بعد اپنے پرانے معمول کے مطابق سِری (آہستہ) اذکار اور وظائف پڑھتے۔ اس کے بعد صبح کا ناشتہ کرتے۔ صبح کے ناشتے میں چینی والی سبز چائے کے ساتھ روٹی کھاتے۔ مگر کھانا بہت کم کھاتے تھے۔ چائے تو صرف صبح اور سہ پہر کو پیتے تھے۔

صبح سے دوپہر تک اکثر وقت ان کی مصروفیت قرآن کریم کی تلاوت، ذکر وفکر، مطالعہ کے لیے تفسیر جلالین، معارف القرآن اور تفسیر کابلی سمیت متعدد تفاسیر، بخاری شریف اور مشکوٰۃ المصابیح سمیت احادیث کی کتابیں اور ہدایہ سمیت فقہ کی کچھ کتابیں انہیں میسر تھیں۔ اس کے علاوہ بھی مختلف کتابیں ان کے پاس ہوتی تھیں، جیسے حیات الصحابہ وغیرہ۔ مگر ان کا زیادہ تر وقت قرآن کریم کی تلاوت اور تفاسیر کے مطالعے میں گزرتا تھا۔ دن میں ایک وقت ریڈیو بھی سنتے اور دنیا بھر اور افغانستان کے حالات سے ہمیشہ خود کو باخبر رکھتے۔

عبدالجبار عمری کہتے ہیں کہ اس طویل عرصے میں مجھے معلوم ہوا کہ امیر المومنینؒ کا ایک خاص وصف یہ تھا کہ کھانا، بولنا اور سونا ان کا بہت کم ہوتا تھا۔ کبھی امتیازی کھانے کا مطالبہ اور توقع نہیں کی۔ جو کچھ افغانستان کے عام غریب گھروں میں پکتا تھا وہی کھاتے۔ کھانا اتنا کم کھاتے تھے کہ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کبھی انہوں نے آدھی روٹی سے زیادہ کھایا ہو۔ بات چیت بھی بہت کم کرتے تھے حتیٰ کہ رسمی اجلاسوں میں بھی ان کی گفتگو بہت مختصر ہوتی تھی۔ صرف اہم اور کام کی بات کر کے خاموش ہو جاتے۔ اجلاسوں میں اکثر وقت خاموش رہ کر دوسروں کی بات سنتے۔ ہر بات پہلے خوب سن کر سمجھتے اس کے بعد اس پر رائے دیتے۔

امیر المومنین کی نیند بہت ہلکی ہوتی تھی۔ان کے جاگنے اور سونے میں فرق کرنا مشکل ہوتا تھا۔جتنی بھی گہری نیند سے انہیں جگایا جاتا وہ ایسے جواب دیتے جیسے سوئے ہی نہیں تھے۔ شروع سے ہی بہت کم سوتے تھے۔

قندھار سے نکلتے ہوئے امیر المومنینؒ اپنے ساتھ صرف دو جوڑے کپڑے لے کر نکلے تھے۔ایک پہنا ہوا تھا اور دوسرا ایک اضافی جوڑا۔ان کے پاس کچھ رقم بھی تھی جن سے وہ اپنا صدقۃ الفطر اور کچھ دیگر ذاتی مصارف ادا کرتے تھے۔قندھار سے نکلتے ہوئے ان کے ساتھیوں نے ان کے بیگ میں کچھ رقم ان کی لاعلمی میں رکھی تھی۔روپوشی کے ایام میں ان کے اور ان کے ساتھیوں کے بعض بڑے مصارف اسی رقم سے پورے کیے جاتے۔

امیر المومنین روپوشی کے ایام میں بھی ماضی کی طرح طویل کپڑے پہنتے، اور پاج (ایک مخصوص باریک کپڑا جس کی پگڑی افغانستان اور دیگر پشتون علاقوں میں پہنی جاتی ہے) کی بڑی پگڑی پہنتے تھے۔کپڑے اکثر ان کے خاندان کی طرف سے سلے ہوئے آتے۔

کثرتِ ذکر وفکر ومراقبہ

عبدالجبار عمری کہتے ہیں کہ امیر المومنین کی زندگی کے اس تیرہ سالہ دور میں، میں نے ان میں کچھ ایسی خصوصیات دیکھیں کہ اگر بیان کروں تو شاید بہت سے لوگ یقین نہ کریں۔ان میں سے ایک ان کے مراقبے اور تفکر کی کیفیت تھی۔وہ دن رات ہر وقت مراقبے اور گہری فکر میں ہوتے اور ذکر میں مشغول رہتے۔

امیر المومنین کا مزاج تھا کہ وہ کسی کو ڈانٹتے نہیں تھے۔ایک دن جب مغرب کی اذان ہو رہی تھی، میں ان کے کمرے میں آیا۔وہ مراقبے کی حالت میں تھے۔میرا خیال تھا کہ وہ سوئے ہوئے ہیں۔میں نے انہیں جگانے کے لیے آواز دی کیونکہ نماز کا وقت ہو رہا تھا۔انہوں نے سر اٹھایا تو مجھے خوب ڈانٹا۔بعد میں اپنی اس ڈانٹ پر معذرت کرتے ہوئے کہا خدا کرے آپ میری ڈانٹ سے ناراض نہ ہوئے ہوں، میں سو نہیں رہا تھا مگر اس ذکر وفکر کے وقت کبھی کبھی مجھ پر ایسی حالت آجاتی ہے جس میں اتنی لذت ہوتی ہے کہ وہ لذت مجھے دنیا کی کسی نعمت میں نہیں ملتی۔ میں اس وقت ایسی ہی کیفیت میں تھا جب آپ نے آواز دی۔

عبدالجبار عمری کا کہنا ہے کہ عالمی میڈیا یہ پروپیگنڈا کرتا ہے کہ امیر المومنین ایک درشت مزاج اور انتہا پسند شخص تھے مگر ان کی طویل رفاقت میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ معتدل مزاج کے مالک تھے۔ ان کا ہر کام اعتدال سے ہوتا تھا۔ عام زندگی سے لے کر عبادات تک ان کی زندگی کا ایک بہترین وصف جس سے میں متاثر ہوا وہ ان کا صبر تھا۔

تیرہ سالہ تنہائی میں کبھی میں نے انہیں بے صبری کا مظاہرہ کرتے نہیں دیکھا۔ کبھی انہوں نے کسی چیز کی شکایت نہیں کی۔ اپنی والدہ (امیر المومنین کی والدہ محترمہ اب بھی حیات ہیں) اور اپنے بچوں کو یاد کرتے مگر اپنی تنہائی کے حوالے سے کسی افسوس کا اظہار کبھی نہیں کیا۔ یہاں تک کہ بیماری پر انہیں اس قدر کنٹرول تھا کہ اکثر وقت بیمار اور تکلیف میں ہوتے مگر ان کی حالت دیکھ کر پتا نہیں چلتا تھا کہ بیمار ہیں۔ نہ کسی قسم کی شکایت کرتے۔ بیماریاں برداشت کرتے اور شدید صبر کا مظاہرہ کرتے۔ جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا وہ زیادہ گفتگو نہیں کرتے تھے۔ اس لیے ہمیشہ نامناسب گفتگو اور غیبت کی بجائے نصیحت کرتے۔ نصیحت کرتے ہوئے ان کی آواز بلند ہوجاتی۔ خدا سے ڈرو ان کی نصیحت میں اس جملے کا تکرار زیادہ ہوتا۔ امیر المومنین آسائش اور راحتوں کا مزاج نہیں رکھتے تھے۔ انہیں سادہ زندگی پسند تھی۔ کسی سے خدمت یا خاص امتیازی توجہ کی توقع نہیں رکھتے تھے۔ مزاج میں رحم دلی بہت زیادہ تھی۔ اکثر مجاہدین کو نصیحت کرتے کہ کارروائیوں میں احتیاط سے کام لیا کرو تاکہ بے گناہ لوگ نشانہ نہ بنیں۔ عام لوگوں کی شہادت کی خبر سن کر بہت افسردہ ہوتے۔

جس علاقے میں امیر المومنین کی رہائش تھی وہاں ایک بار برف باری ہوئی۔ برف باری میں کچھ پرندے ٹھٹھر کر برف کے نیچے دب گئے تھے اور اُڑ نہیں سکتے تھے۔ ایسے پرندوں کو بچے پکڑ کر اٹھا لیتے۔ اس گھر کا ایک بچہ ایسا ہی ایک پرندہ اٹھا کر ان کے پاس لایا۔ امیر المومنین نے پہلے تو بچے کو بہلا کر پرندہ ان کے حوالے کرنے پر راضی کیا۔ پھر پرندہ ان سے لے کر آتش دان کے پاس رکھ دیا تاکہ گرم ہوکر حرکت کے قابل ہوجائے۔ جب اس کے پر کھل گئے تو خود ہی اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر باہر آئے اور پرندے کو ہوا میں اُڑا دیا۔ (جاری ہے)

ہم پاکستان کیوں بنانا چاہتے ہیں؟

تحریر: علامہ محمد اسد
ترجمہ: سیّد قاسم محمود

(شائع کردہ تحریک استحکام پاکستان)

مختصر حالات: علامہ محمد اسد (1900ء-1992ء) نومسلم ہیں، نسلاً بنی اسرائیل سے تعلق رکھتے ہیں، علامہ اقبال، چودھری نیاز علی خان اور دوسرے اکابرینِ ملّت سے شناسائی اور اچھے تعلّقات رکھتے تھے، قائداعظم محمد علی جناح کے بھی مدّاح تھے، عالمِ دین تھے، قرآن وحدیث کے علاوہ تورات، تالمود، زبور، انجیل پر بھی انہیں عبور تھا۔ پاکستان ان کی آنکھوں کے سامنے بنا ان پر قیامِ پاکستان کے مقاصد صرف واضح ہی نہیں تھے بلکہ وہ قوم کی رہنمائی کر کے ان کو واضح دینی مقاصد کی طرف لے جانے والوں میں سے تھے کہ غلام ابن غلام مسلمان قوم کو آزادی دلا کر ایک اسلامی ریاست قائم کی جائے تا کہ وہ اسلامی تعلیمات کا قرآن وحدیث کی روشنی میں ایک اسلامی عادلانہ نظامِ زندگی یعنی JUST POLITICO- SOCIO-ECONOMIC SYSTEM کو عملی جامہ پہنایا جاسکے۔ اس کے برعکس یہ مغربی ایجنڈا ہے جنہوں نے 11 راگست والی قائداعظم کی تقریر گھڑی اور اس پر سیکولر اور لبرل جمہوری پاکستان کی اپنی من بھاتی عمارت تعمیر کر دی یہ ابلیسی مغربی تہذیب کے دلدادہ لوگ پاکستان کو اپنے مقاصد تخلیق کی طرف بڑھنے سے روکنے کے ایجنڈے پر کام کر رہے ہیں ساری NGO's، ساری فلمی صنعت، فلمی ستارے، کرکٹ کا کھیل، اولمپکس گیمز اسی مغربی اسلام مخالف ایجنڈے کا حصہ ہیں۔

علامہ محمد اسد نے قیامِ پاکستان کے بعد بھی قائد اعظم محمد علی جناح کے دست راست کے طور پر کام کیا تھا، انھیں پاکستان کی شہریت دی گئی، پاکستان کا

پہلا پاسپورٹ انہیں جاری ہوا، ان کو پاکستان کی نظریاتی بنیادوں پر تعمیر جدید (RECONSTRUCTION) کا نیا محکمہ بنا کر اس کا سربراہ بنایا گیا۔ قائداعظم کی طرح علامہ محمد اسد بھی علامہ اقبال کے نظریات کے حامی تھے، اسی وجہ سے اس محکمہ میں فکرِ اقبال سے متعلق لوگ جمع ہوئے۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم انہیں کے معاون (ASSISTANT) کے طور پر متعین ہوئے، کراچی بندر روڈ پر ان کا دفتر قائم ہوا۔ مگر قائداعظم کی رحلت کے بعد ان کا دفتر بند، ان کا محکمہ ختم اور ان کو پاکستان سے نکال کر UNO میں پاکستان کا مستقل مندوب بنا دیا گیا۔ اَنا للہ وانا الیہ راجعون۔

بہت محنت اور کوششوں سے فکر اقبال کو بطور تبرک زندہ رکھنے کے لیے اقبال اکیڈمی قائم کی گئی اور ڈاکٹر رفیع الدین اس کے سربراہ رہے۔ اس وقت کی سیاسی قیادت کا مطمع نظر یہ تھا کہ اقبال اکیڈمی بنا کر ایسا ادارہ بنا دیا جائے جس میں کچھ اقبال شناس لوگوں کو ایک 'بیٹھک'، تکیہ اور ہائیڈ پارک مل جائے وہ آپس میں اس موضوع پر گفتگو کر کے محظوظ ہوتے رہیں اور مطمئن رہیں اور حکومت اس بات کی نگرانی کرتی رہے کہ خبردار فکر اقبال کی کوئی رمق ملکی قانون، نظامِ تعلیم، معیشت (سودی بینکنگ کا خاتمہ)، اخلاق، معاشرت، اسلام کے عادلانہ نظام کا نفاذ وغیرہ پر نہ پڑنے دی جائے بلکہ اس کو BYE-PASS کر کے چپکے چپکے ملک کو سیکولر، لبرل، مغربی جمہوری ملک بنا کر امریکی اشیر باد اور امریکی امداد سے چلایا جائے اور آہستہ آہستہ ملک کے باشندوں کے ذہنوں سے اسلام کو کھرچ کھرچ کر نکال دیا جائے۔ آج اس سوچ کے مناظر بچشم سر دیکھے جا سکتے ہیں کہ ملک میں گزشتہ تین سال کی محنت سے SNG (یکساں قومی نصاب تعلیم) بنا مگر اس میں اقبال کے تعلیمی نظریات، ڈاکٹر رفیع الدین کی تعلیمی کاوشوں اور تجاویز کا کہیں تذکرہ تک بھی نہ آ سکا۔ شاباش امریکہ زندہ باد اور ملک میں امریکی نمک خوار برادری اور اقبال ناشناس ماہرین تعلیم زندہ باد۔

آیئے! علامہ محمد اسد مرحوم کی اس تحریر میں جو انہوں نے قیامِ پاکستان کے مقاصد پر لکھی تھی جس کا ترجمہ مشہور مورّخ، ادیب، اہل قلم جناب سیّد قاسم محمود مرحوم نے کیا تھا، ملاحظہ فرمائیں کہ بانیانِ پاکستان کے ذہنوں میں 70 سال پہلے کیا تھا اور اب پاکستان میں کیا ہو رہا ہے۔ (ادارہ)

بِسۡمِہٖ تَعَالٰی

(علامہ محمد اسد کا یہ فکر انگیز مقالہ پاکستان بننے سے تین ماہ قبل مئی 1947ء میں جریدہ ''عرفات'' میں شائع ہوا تھا)

تین چار ماہ پہلے کی بات ہے میں نے ''عرفات'' کے شمارہ فروری میں ایک سوال اٹھایا تھا: ''کیا واقعی ہم اسلام چاہتے ہیں؟''۔ یہ کوئی خطیبانہ سوال نہیں تھا کہ قارئین کی دینی اصلاح کے لیے ذہن میں آیا ہو۔ فی الحقیقت یہ ایسا سوال تھا جو ہمیں اپنے آپ سے ضرور پوچھنا چاہیے یہ کہ ''کیا ہم واقعی اسلام چاہتے ہیں؟''۔ وقت آ گیا ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کو اس سوال کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اپنے حال و مستقبل کے حوالے سے اس سوال کے تمام نتائج و عواقب کا پورا پورا تجزیہ کرنا ہوگا اور اپنے اندر اخلاقی جرأت پیدا کرنی ہوگی کہ اس سوال کے جواب میں ایمان داری سے ''ہاں'' یا ایمان داری سے ''نہ'' کہہ سکیں۔ فی زمانہ، جیسے حالات ہمارے مشاہدے میں آ رہے ہیں، ان کی کیفیت یہ ہے کہ بے شمار مسلمان زبان سے تو کہتے ہیں ''ہاں'' اور عمل سے کہتے ہیں ''نہ''۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسلام کی باتیں تو بہت کرتے ہیں اور بلند بانگ ادّعا کے ساتھ کہتے ہیں کہ اسلام بہترین ضابطہ حیات ہے، اسلام واحد ضابطہ حیات ہے جو انسانیت کو تباہی کے راستے سے بچا سکتا ہے، اس لئے اسلام واحد منزلِ مقصود ہے جس کے نفاذ کے لئے کوشش کی جانی چاہیے۔ یہ لوگ کہتے تو یہی ہیں، لیکن اپنے اعمال اور سماجی رویوں سے وہ اسلام سے زیادہ سے زیادہ دور ہوتے جاتے ہیں۔ ہماری جدید تاریخ میں اسلام کے بارے میں اتنی باتیں کبھی نہیں ہوئی تھیں، جتنی آج کے ہندوستان میں ہو رہی ہیں۔ ہر طرف اسلام، اسلام کا غلغلہ ہے اور اس کا برعکس بھی درست ہے کہ اسلام کی سچی روح کے مطابق عملاً اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی گزارنے کی طرف اتنی بے توجہی کبھی نہیں برتی گئی جتنی آج کے ہندوستان میں برتی جا رہی ہے۔

اس مقام پر شاید میرے اس دعوے کے خلاف آپ کے دل میں شکایت یا احتجاج پیدا ہو اور آپ اس زبردست جوش و خروش کی طرف توجہ دلائیں جو نظریۂ پاکستان نے مسلمانانِ ہند میں برپا کر رکھا ہے۔ آپ کہیں گے اور ایسا کہنے میں آپ حق بجانب ہوں گے کہ مسلمانانِ ہند بالآخر اپنی طویل گراں خوابی سے بیدار ہو گئے ہیں، انہوں نے ایک عظیم مقصد کے لئے اتنا

زبردست اتفاق واتحاد حاصل کرلیا ہے کہ اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا یہ کہ مسلمان ہونے کی بنا پر انہوں نے اپنا جداگانہ ثقافتی تشخص قائم کرنے کا شعور حاصل کرلیا یہ کہ تحریک پاکستان کا نعرہ ہی ''لا اِلٰہ اِلا اللہ'' مقرر ہوا ہے، یہ کہ انہوں نے ایسی سیاست حاکمہ قائم کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے جس میں مسلم تصورِ کائنات، مسلم اخلاقیات اور مسلم معاشرتی افکار مکمل اظہار کی راہ پاسکیں۔ اور شاید آپ کسی قدر رنجیدگی سے مجھ سے دریافت کریں گے کہ کیا میں ان سب باتوں کو اسلامی نقطۂ نظر سے بے وقعت اور غیر اہم خیال کرتا ہوں؟

بات یہ ہے کہ میں ہرگز ہرگز ان کو بے وقعت اور غیر اہم خیال نہیں کرتا۔ میری نظر میں یہ بہت وقیع اور اہم ہے۔ میرا عقیدہ ہے (اور گزشتہ چودہ سال سے میں اس عقیدے پر قائم ہوں) کہ ہندوستان میں اسلام کا کوئی مستقبل نہیں، ماسواء اس کے کہ پاکستان ایک حقیقت بن کر قائم ہوجائے۔ اگر پاکستان واقعی قائم ہو جاتا ہے، تو پورے عالم اسلام میں ایک روحانی انقلاب آسکتا ہے، یہ ثابت کرنے کے لئے کہ جس طرح تیرہ سو سال پہلے ایک نظریاتی، اسلامی ہیئت حاکمہ قائم کرنا ممکن تھا، کم وبیش اسی طرح آج بھی ممکن ہے لیکن ہمیں ایک سوال کا جواب دینا ہوگا۔ کیا تحریکِ پاکستان کے تمام قائدین اور اہلِ دانش جو تحریک کے ہراول ہیں، کیا وہ اپنے ان دعووں میں سنجیدہ اور مخلص ہیں کہ اسلام اور صرف اسلام ہی ان کی جدوجہد کا اوّلین محرک ہے؟ جب وہ کہتے ہیں کہ ''پاکستان کا مطلب کیا، لا الٰہ اِلا اللہ'' تو کیا وہ اس کا مطلب بھی جانتے ہیں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں؟ پاکستان کا نظریہ اور پاکستان کا خواب کیا ہم سب کے ذہنوں میں ایک ہی ہے، یا مختلف ومتفرق ہے؟

یہ سوالات معمولی نہیں ہیں۔ یہ بڑے سوال ہیں، اتنے بڑے کہ ہمارے موجودہ مصائب سے بھی بڑے ہیں اور ان انفرادی تکالیف سے بھی بڑھ کر ہیں جو اس ملک میں ہزاروں مسلمان مرد وزن سردست برداشت کررہے ہیں۔ ان سوالوں کے جواب ہی سے فیصلہ ہوگا اس امر کا کہ یہ تکالیف اور قربانیاں مستقبل کے ایک نئے تناظر یعنی اسلام کے مکمل اثبات ونفاذ کی نوید لائیں گی یا ایک قومی مسلم ریاست کی تشکیل کے ذریعے سے مسلمانانِ ہند کی محض اقتصادی صورتحال کی اصلاح وترقی کی ضامن ہوں گی۔

یہاں میں جریدہ ’عرفات‘ کے شمارہ فروری 1947ء میں شائع شدہ اپنے ایک مضمون کا اقتباس پیش کرنے کی جسارت چاہتا ہوں۔ میں نے لکھا تھا:

’’تحریک پاکستان ایک نئے اسلامی نظام کا نقطۂ آغاز بن سکتی ہے، بشرطیکہ ہم مسلمان محسوس کریں اور قیامِ پاکستان کے بعد بھی برابر محسوس کرتے رہیں کہ اس تحریک کی حقیقی اور تاریخی وجہِ جواز یہ نہیں ہے کہ ہم اس ملک کے دوسرے باشندوں سے مختلف لباس پہنتے ہیں، مختلف زبان بولتے ہیں یا مختلف انداز میں علیک سلیک کرتے ہیں، یا یہ کہ ہمیں دوسری قوموں سے کچھ شکایات ہیں یا یہ کہ ہمیں زیادہ معاشی مواقع کی خواہش ہے یا یہ کہ ان لوگوں کے لیے جو خود کو محض عادت کے طور پر ’مسلمان‘ کہلواتے ہیں، زیادہ کشادہ جگہ کی طلب ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہے۔ مطالبہ پاکستان کا اگر کوئی جواز ہے تو صرف یہ ہے کہ ایک سچی اسلامی مملکت قائم کی جائے، دوسرے لفظوں میں یہ کہ عملی زندگی میں اسلامی احکام وشعائر رائج کیے جائیں‘‘۔

’’پاکستان کے بارے میں میرا تصور یہی ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ بہت سے مسلمانوں کا بھی یہی تصور ہے۔ میں نے ’بہت سے‘ کہا ہے، ’سب‘ کہا اور نہ ’بیشتر‘ کہا۔ اس احتیاط کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے اکثر و بیشتر تعلیم یافتہ طبقے کا تصورِ پاکستان یہ نہیں ہے۔ ان کے نزدیک پاکستان کا مطلب فقط یہ ہے کہ مسلمانانِ ہند کو ہندو غلبے سے نجات دلائی جائے اور ایک ایسی سیاسی ہیئت حاکمہ قائم کی جائے جہاں مسلمانوں کو اقتصادی مفہوم میں اپنی ایک خودمختار جگہ مل جائے۔ ان کے نزدیک اسلام کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ متعلقہ لوگوں کا مذہب اتفاق سے اسلام ہے جیسے کہ آئرلینڈ کی جدوجہد آزادی میں کیتھولکیت کو بھی اس لئے کچھ اہمیت حاصل ہوگئی تھی کہ آئرلینڈ کے بیشتر باشندوں کا یہی مذہب تھا اور جس طرح کہ آئرستانی قومیّت کی تحریک میں کیتھولکیت کو محض ایک اضافی، جذباتی عنصر کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی، اسی طرح خدشہ ہے کہ تحریک پاکستان میں اسلام کے نام پر نعرے بازی بھی کہیں قومی خود اختیاری کی جدوجہد میں محض ایک اضافی، جذباتی عنصر بن کر نہ رہ جائے‘‘۔

میں صاف صاف اور واشگاف لفظوں میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ہمارے بہت سے

بھائی اور بہنیں پاکستان کے روحانی و اسلامی مقاصد پر یقین تو کیا رکھیں گے، وہ ان کی مطلق پروا بھی نہیں کرتے، اور وہ ایسے جذبات کے بہاؤ میں بہے چلے جا رہے ہیں جو قوم پرستی کے جذبات سے ملتے جلتے ہیں۔ اور یہ بات خاص طور پر ان مسلمانوں پر لاگو ہوتی ہے جنہوں نے مغربی خطوط پر تعلیم پائی ہے۔ دین اسلام سے ان کی بے اعتنائی گزشتہ چند عشروں میں پختہ ہوئی ہے۔ شرعی احکام کی پابندی ایسے لوگوں کے لیے خاصی پریشان کن اور تکلیف دہ بن گئی ہے۔ مغربی طرز فکر کے سوا کسی اور انداز میں سوچنے سمجھنے کی قابلیت ان میں مفقود ہو چکی ہے۔ چنانچہ ان کے قلوب میں یہ عقیدہ پیدا ہی نہیں ہوتا کہ دنیا کے معاشرتی اور سیاسی مسائل خالص مذہبی اصولوں کے تحت حل پذیر ہو سکتے ہیں۔ اسلام کا نام ان کی زبان پر آتا ہے تو محض رسماً آتا ہے، کسی اصول و نظریے کے تابع ہو کر نہیں آتا۔ انہیں اسلام سے کوئی دلچسپی ہوتی ہے، تو زیادہ سے زیادہ یہ کہ اپنی قوم کی روایات میں ثقافتی اقدار کا بھرم رکھا جائے۔ اس قسم کی ذہنیت والے لوگوں کے لیے پاکستان کا مطالبہ ویسا ہی قومی مطالبہ ہے، جیسے مصر مصریوں کے لیے، چیکوسلواکیہ چیک لوگوں کے لیے، یعنی لوگوں کے ایک گروہ کی جانب سے، چند مخصوص اقتصادی مفادات اور چند مشترکہ ثقافتی خصائص (اور مسلمانانِ ہند کی صورت میں اسلام سے وابستہ ثقافتی خصائص) کی اساس پر خود اختیاری کا مطالبہ۔ نہ اس سے زیادہ نہ اس سے کم۔

یقیناً آپ مجھ سے اتفاق کریں کہ یہ پاکستان کا بہت کمزور تصور ہے۔ یہ تصور اس اسلامی جوش و خروش سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا، جس کا مظاہرہ ہمارے عوام کی بہت بڑی اکثریت بڑے واضح، لیکن بڑے بے ہنگم طریقے سے کر رہی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اکثر ہمارے نام نہاد اربابِ دانش اسلام سے صرف اس حد تک غرض رکھتے ہیں، جس حد تک کہ وہ ان کی سیاسی خود اختیاری کی جدوجہد کے لیے مفید مطلب ہو سکتا ہے، جبکہ ہمارے عوام خود اختیاری کا مطالبہ صرف احیائے اسلام کی آرزو کے تحت کر رہے ہیں لیکن چونکہ ان کی آرزوئیں واضح نہیں ہیں اور وہ یہ نہیں جانتے کہ انہیں حاصل کیوں کر کیا جاتا ہے، اس لیے وہ قدرتاً اہل قیادت پر بھروسہ کرتے ہیں۔ پس قیادت کے روحانی اوصاف ہی سے بالآخر یہ طے ہوگا کہ پاکستان کے لیے مسلمانوں کی جدوجہد کی روحانی کیفیت کیا ہوگی اور پاکستان اپنے قیام کے بعد کیسا رنگ روپ اختیار کرے گا۔

پاکستان کی انفرادیت

جہاں تک مسلمانانِ ہند کا تعلق ہے، تحریک پاکستان کی جڑیں ان کے اس جبلی احساس میں پیوست ہیں کہ وہ ایک ''نظریاتی قوم'' ہیں، اور اسی لیے وہ خودمختار، جداگانہ سیاسی وجود کے حق دار ہیں۔ بالفاظ دیگر وہ محسوس کرتے اور جانتے ہیں کہ ان کا جداگانہ تشخص، دوسری اقوام کی طرح، مشترکہ نسلی مشابہتوں اور قرابتوں یا مشترکہ ثقافتی اقدار و روایات کے شعور کی بنیاد پر قرار نہیں پاتا، بلکہ اسلامی نظریہ و اعتقاد سے مشترکہ وابستگی کی اساس پر قرار پاتا ہے۔ پس ان پر لازم آجاتا ہے کہ وہ اپنے جداگانہ تشخص کے جواز کی خاطر ایسا معاشرتی و سیاسی نظام قائم کریں جس میں اسلامی نظریہ و اعتقاد (یعنی شریعت) ان کی قومیّت کے ہر پہلو اور ہر مظہر میں سب کو دکھائی دے۔

یہ ہے تحریک پاکستان کا حقیقی اور تاریخی نصب العین۔ یہ ہرگز ہندوستان میں مسلم اقلیت کے اجتماعی مسئلے کا حل نہیں ہے۔ پاکستان میں ہمیشہ غیر مسلم اقلیتیں رہیں گی، جس طرح کہ ہندوستان میں مسلم اقلیتیں رہیں گی، اس لیے اقلیتوں کے مسئلے کے سراسر حل کی ذمہ داری پاکستان پر عائد نہیں ہوتی۔ یہی ہے وہ نکتہ جس پر ہمیں اور ہمارے نکتہ چینوں کو ذرا رُک کر غور و فکر کر لینا چاہیے۔ اقلیتوں کا مسئلہ بے شک ہر لحاظ سے ہندوستان کے سیاسی مستقبل کے لئے انتہائی اہم ہے، لیکن یہ مسئلہ بنیادی طور پر تحریک پاکستان کا ذمہ دار نہیں ہے۔ حقیقت صرف اتنی ہے کہ اقلیتوں کا مسئلہ تحریک پاکستان کے اصلی نصب العین کا ایک اتفاقی لازمہ ہے۔ تحریک پاکستان کا اصلی نصب العین کیا ہے؟ ایک اسلامی ہیئت حاکمہ کا قیام جس میں ہمارا نظریہ حقیقت کا رنگ روپ اختیار کر سکے۔ صرف اسی نصب العین کی روشنی میں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ بمبئی یا مدراس کے مسلمان، جن کو خوب معلوم ہے کہ ان کے صوبے پاکستان کا حصہ نہیں بنیں گے، حصولِ پاکستان کے اتنے ہی متمنی ہیں جتنے پنجاب یا بنگال کے مسلمان۔ بمبئی اور مدراس کے مسلمان یہ جاننے کے باوجود کہ ان کے صوبے جغرافیائی و علاقائی اعتبار سے پاکستان میں شامل نہیں ہوں گے، اگر 'مسلم اکثریت' کے صوبوں کے بھائیوں کی مانند پوری شدت و توانائی سے تحریکِ پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ پاکستان میں اسلامی نظام کا نفاذ اس

دعوے کا ٹھوس ثبوت ہوگا کہ اسلام ایک عملی مذہب اور مکمل ضابطہ حیات ہے، اور یہ کہ مسلمان محض مسلمان ہونے کی بنا پر ایک ملت ہیں خواہ وہ جغرافیائی لحاظ سے کسی بھی علاقے میں آباد ہوں اور اگر غیر مسلم ہمارے اس دعوے پر اس بنیاد پر نکتہ چینی کرتے ہیں کہ دنیا میں کہیں بھی، حتیٰ کہ دنیائے اسلام میں بھی کسی ملک یا علاقے میں محض مذہبی عقائد کی اساس پر جداگانہ قومیّت کا مطالبہ نہیں کیا جاتا، تو ہمارا جواب یہ ہے کہ یہی تو تحریک پاکستان کی خاص انفرادیت ہے۔

کیا دوسروں کو یہ طے کرنے کا حق دے دیا جائے کہ ہماری قومیّت کے عناصر کیا ہونے چاہئیں اور کیا نہیں؟ کیا ہمیں اس حقیقت کے اعتراف میں شرمساری محسوس کرنی چاہیے کہ ہمارا سیاسی نصب العین ترکوں، مصریوں، افغانیوں، شامیوں، یا ایرانیوں کے موجود سیاسی نصب العین سے بالکل مختلف ہے؟ کیا ہمیں یہ سوچ کر فخر نہیں کرنا چاہیے کہ تمام مسلم اقوام میں یہ ہم اور صرف ہم مسلمانانِ ہند ہیں جو گردشِ ایام کو پیچھے کی طرف ہٹا کر اُمتِ واحدہ کے اس تصور کی جستجو میں نکل کھڑے ہیں جس کی ہدایت انسانِ کامل ﷺ نے ہمیشہ کے لیے روشن کر دی تھی۔

پس دنیائے اسلام میں جہاں کہیں بھی سیاسی عوامی تحریکیں چل رہی ہیں، ان سب کے مقابلے میں تحریک پاکستان فی الحقیقت منفرد و یکتا ہے۔ اس جیسی اور کوئی تحریک نہیں۔ بلاشبہ وسیع و عریض دنیائے اسلام میں اور بھی لوگ ہیں جو اسلام کے سچے شیدائی ہیں، جو رسول کریم ﷺ کی تعلیمات کے فروغ کے لیے اور اپنی قوم کی اخلاقی سربلندی کے لیے بے لوث خدمات انجام دے رہے ہیں، لیکن پوری دنیا میں کہیں بھی ایسا نہیں ہے سوائے تحریک پاکستان کے، کہ پوری کی پوری مسلم قوم منزلِ اسلام کی جانب گامزن ہوگئی ہو۔ پوری دنیائے اسلام میں کوئی عوامی تحریک ایسی نہیں ہے، جس کی اساس اسلامی جذبے پر رکھی گئی ہو، سوائے تحریک پاکستان کے۔ کسی بھی موجودہ اسلامی ملک میں ایسی تحریک نہیں چلی جس کا مقصد اسلامی نظام کا نفاذ ہو، سوائے تحریک پاکستان کے۔ بعض اسلامی ممالک مثلاً ترکی اور ایران، اپنے سرکاری و حکومتی مقاصد میں علانیہ غیر اسلامی ہیں اور انہوں نے کھلم کھلا اعلان کر رکھا ہے کہ اسلام کو سیاست اور عوام کی معاشرتی زندگی سے الگ رکھنا چاہیے۔ حتیٰ کہ ان اسلامی ملکوں میں بھی، جہاں مذہب کی تھوڑی بہت قدر باقی ہے، اور جہاں مختلف مدارج میں اس کی روحانی میراث برقرار ہے، وہ بھی یوں سمجھئے کہ صرف ان معنوں میں

'اسلامی' ہیں کہ وہاں کے باشندوں کی اکثریت کا مذہب اسلام ہے، جبکہ ان کے سیاسی مقاصد وعزائم اسلامی اصول و نظائر کے تابع نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے حکمران یا مقتدر گروہ جس چیز کو 'قومی مفادات' کہتے ہیں مغرب کے مفہوم ہی میں 'قومی مفادات' ہیں۔ اس لئے ان ملکوں کی سیاسی تنظیمات سے، خواہ وہ سعودی عرب یا افغانستان کی طرح مطلق العنان سلطنت ہوں یا شام کی طرح ری پبلک ہوں یا مصر اور عراق کی طرح آئینی بادشاہت ہوں، اسلام کی طرف جھکاؤ رکھنے کی توقع نہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان ملکوں کے عوام یا حکمران اسلام سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مختلف تاریخی وجوہ سے ان کی حکومتوں یا سیاسی نظاموں کا اسلام سے براہِ راست تعلق نہیں ہے۔

تحریکِ پاکستان کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ بلاشبہ اس تحریک میں اسلام سے جذباتی وابستگی اور اسلامی سیاسی نظام میں آپس میں گہرا تعلق ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اس تحریک کی عملی کامیابی کا سبب ہمارے عوام کی یہ جذباتی خواہش (اگرچہ مبہم) ہے کہ ایک ایسی ریاست قائم کی جائے، جہاں حکومت کی اشکال واغراض اسلام کے اصول واحکام کے مطابق ہوں، ایک ایسی ریاست جہاں اسلام عوام کی مذہبی وثقافتی روایات کا محض ٹھپہ نہیں ہوگا بلکہ ریاست کی تشکیل وتاسیس کا بنیادی مقصد ہوگا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ایک ایسی نئی اسلامی ریاست جو جدید دنیا میں پہلی ریاست ہوگی ـــــ تمام اسلامی ملکوں کے سیاسی افکار میں انقلاب برپا کردے گی اور دوسرے اسلامی ملکوں کے عوام میں بھی تحریک پیدا کرے گی کہ وہ ایسے ہی نصب العین کے لیے جدوجہد کریں اور یوں یہ ریاست (پاکستان) دنیا کے اکثر حصوں میں تجدید واحیائے اسلام کی عالمگیر تحریک کا پیش خیمہ بن جائے گی۔

اس لئے مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ تحریک پاکستان احیائے اسلام کے لیے زبردست امکان کا درجہ رکھتی ہے اور جہاں تک میری نظر جاتی ہے، تحریک پاکستان ایک ایسی دنیا میں تجدید واحیاء کی ''واحد امید'' ہے جو بڑی تیزی سے اسلامی مقاصد سے دور ہٹتی جارہی ہے۔ لیکن یہ ''واحد امید'' بھی اس اعتبار پر قائم ہے کہ ہمارے قائدین اور عوام قیامِ پاکستان کا اصل مقصد اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیں اور اپنی تحریک کو ان نام نہاد ''قومی'' تحریکوں میں شامل

کرنے کی ترغیب میں نہ آئیں جو آئے دن جدید دنیائے اسلام میں اُبھرتی رہتی ہیں۔ یہ ایک بہت بڑا خطرہ ہے، اور مجھے کبھی کبھی اس کے رونما ہونے کا خدشہ صاف نظر آتا ہے۔ میری مراد نسلی خطوط پر قوم پرستی سے نہیں ہے، جس کی مثالیں دوسرے ملکوں میں دکھائی دیتی ہیں۔ مسلمانانِ ہند میں نسلی بنیاد پر قوم پرستی ناممکن ہے، کیونکہ یہاں مسلم قوم انتہائی متنوع نسلی عناصر سے ترکیب پائی ہے۔ لیکن تحریک پاکستان کے اپنے اصلی نظریاتی راستے سے منحرف ہونے کا خطرہ مجھے ایک اور سبب سے نظر آ رہا ہے۔ وہ سبب یہ ہے کہ ''ثقافتی قومیّت'' پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جا رہا ہے، یعنی مشترکہ نظریاتی اساس کی بجائے چند مخصوص ثقافتی رجحانات، سماجی عادات و رسوم کا تحفظ، اور اس گروہ کے معاشی مفادات کا تحفظ جو بر بنائے پیدائش ''مسلمان'' واقع ہوئے ہیں۔ اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ اسلامی خطوط پر مسلمانوں کے مستقبل کی منصوبہ سازی میں ثقافتی روایات و اقدار اور فوری معاشی تقاضوں کی پاس داری انتہائی اہمیت کے حامل عوامل ہیں، لیکن جو نکتہ ذہن نشین کرانا مقصود ہے، وہ یہ ہے کہ ان انتہائی اہم عوامل کو ہمارے نظریاتی نصب العین سے الگ جداگانہ حیثیت نہیں دی جا سکتی۔

لیکن صاف نظر آ رہا ہے کہ ہمارے اکثر و بیشتر اربابِ دانش سے یہ غلطی سرزد ہو کر رہے گی۔ جب وہ پاکستان کی بات کرتے ہیں تو وہ اکثر یہ تاثر دیتے ہیں کہ جیسے مسلم دنیا کے ''حقیقی'' مفادات اسلام کے خالص نظریاتی مفادات سے جدا کوئی چیز ہوں۔ بالفاظِ دیگر اسلام کے بنیادی نظائر و شعائر سے کوئی تعلق رکھے بغیر بھی ''اچھا پاکستانی'' بننا ممکن ہے۔

میرا خیال ہے کہ قارئین محترم میری اس رائے سے اتفاق کریں گے کہ ''مسلم مفادات'' اور ''اسلامی مفادات'' میں تفریق کرنا بے عقلی کی بات ہے۔ اسلام مسلمانوں کے وجود و تشخص کے چند عوامل و خصائص میں سے محض ایک نہیں ہے بلکہ اسلام تو ان کے وجود کی تاریخی علت اور بنیادی جواز ہے۔ مسلم مفادات کو اسلام سے جدا کوئی چیز خیال کرنا ایسا ہے جیسے کسی ''زندہ چیز'' کو زندہ بھی کہنا اور زندگی سے عاری بھی سمجھنا۔ ایک سوچنے والے آدمی کے نزدیک یہ کیسی بھی بے عقلی کی بات ہو، یہ امر بھی تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ بیشتر لوگ (اور ان میں ہمارے بیشتر اربابِ دانش بھی شامل ہیں) غور و فکر نہ کرنے کی عادت میں مبتلا ہیں۔

فراریت اور خود فریبی

جب ہمارے قائدین اور ہمارے اربابِ دانش حصولِ پاکستان کی خاطر مسلمانوں سے اتحاد، اخوت، ایثار اور ضرورت پڑنے پر اپنا سب کچھ قربان کرنے کی اپیلیں کرتے ہیں تو ان کے ذہن میں ''اسلامی ہیئت حاکمہ'' کا نقشہ کیا ہوتا ہے؟ کیا یہ درست نہیں ہے کہ وہ تحریک پاکستان کے منفی پہلو سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں۔ یہ منفی پہلو ناممکنات سے ہے، یہ کہ غیر مسلم غلبے کے تحت مسلمانوں کا آزادانہ زندگی گزارنا۔ کیا یہ درست نہیں ہے کہ وہ تحریک پاکستان کے مثبت پہلو سے تعلق کم کم رکھتے ہیں۔ مثبت پہلو یہ ہے کہ اسلام کی خاطر، اسلام کے مطابق اپنا معاشرتی و سیاسی نظام قائم کرنا۔ کیا یہ درست نہیں ہے کہ اکثر و بیشتر تعلیم یافتہ مسلمانوں اور ہمارے اکثر سیاسی لیڈروں کے نزدیک اسلام محض غیر مسلموں سے فرقہ وارانہ جدوجہد میں ایک جنگی تدبیر ہے، بجائے اس کے کہ اسلام مقصود بالذات ہوتا۔ گویا اسلام ہماری منزلِ مقصود نہیں، ایک منطقی استدلال ہے۔ ایک اُمنگ نہیں، ایک نعرہ ہے۔ کیا یہ درست نہیں ہے کہ ہمارے اکثر رہنما نام نہاد مسلم قوم کے لیے زیادہ سیاسی قوت اور زیادہ معاشی مراعات کے حصول کے لیے کوشاں ہیں، بجائے اس کے کہ وہ نام نہاد مسلم قوم کو ایک سچی اسلامی قوم بنانے کی کوشش کرتے؟

ہمارے رہنماؤں نے اب تک جو اچھے کام انجام دیے ہیں، میں انہیں کم کر کے نہیں دکھانا چاہتا۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ بعض اعتبار سے ان کے کارنامے بہت زیادہ ہیں اور انتہائی تعریف و توصیف کے مستحق ہیں۔ انہوں نے ایک خوابِ خرگوش میں ڈوبی ہوئی قوم کو بیدار کیا ہے، یہی کارنامہ بہت بڑا ہے۔ پھر یہ کہ انہوں نے قوم میں ایسا زبردست اتحاد پیدا کیا ہے، جو دنیائے اسلام میں اس سے پہلے کبھی نظر نہیں آیا۔ ہر ذی ہوش آدمی اس کا اعتراف کرے گا اور کرنا چاہیے۔ میں جو اپنے بعض رہنماؤں پر الزام تراشی کرتا رہتا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے مسلم عوام کی تقدیر بدل دینے والی اس فیصلہ کن گھڑی میں انہیں روحانی عظمت کی راہ پر گامزن کرنے کی بجائے دیدہ دانستہ اس راہ پر لگا دیا جو بنیادی طور پر ہمارے موجودہ بحران کی ذمہ دار ہے۔ اس بات کو میں سادہ لفظوں میں یوں کہوں گا کہ ہمارے رہنماؤں نے یہ بتانے اور دکھانے کی سنجیدہ کوشش نہیں کی کہ اسلام ہی ہماری موجودہ جدوجہد اور تحریک کا اصل اور بنیادی مقصد و منتہا

ہے۔اس میں شک نہیں، جب وہ اخباری بیان جاری کرتے ہیں یا عوامی جلسے سے خطاب کرتے ہیں تو اسلام کا نام ضرور لیتے ہیں، لیکن لفظ اسلام کا استعمال وہ صیغہ مستقبل میں کرتے ہیں، کہ جب پاکستان وجود میں آ جائے گا تو اسلام بھی آ جائے گا۔انہوں نے کبھی مسلمانوں کے موجودہ طرز فکر اور طرز حیات کو اسلامی اصول واحکام سے زیادہ ہم آہنگ اور مطابق کرنے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی۔میرے خیال میں یہ بہت بڑی فروگزاشت ہے۔ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ مستقبل حال کا بچہ ہے۔اٹل ہے غیر متبدل ہے۔جیسا ہم آج سوچیں اور کریں گے، اس کا اثر ہماری کل کی زندگی پر ضرور پڑے گا۔اگر پاکستان کا مطلب فی الواقعی ''لا اِلٰہ اِلا اللہ'' کے کلمے میں پوشیدہ ہے تو ہمارا عمل بھی اس کلمے کے مطلب کے قریب سے قریب تر ہونا چاہیے، گویا ہمیں صرف اپنے قول کا سچا مسلمان نہیں، بلکہ اپنے عمل کا بھی پکا مسلمان ہونا چاہیے۔

یہ فریضہ اور منصب ہمارے رہنماؤں کا ہے کہ وہ اپنے پیروکاروں کو تلقین کریں کہ آج وہ پکے مسلمان بنیں تا کہ کل سچے پاکستانی بن سکیں۔حالانکہ وہ ہمیں صرف اس امر کا یقین دلاتے ہیں کہ پاکستان کے بنتے ہی ہم پکے مسلمان بن جائیں گے۔

یہ آسان اور لفظی یقین دہانی ہے، اس کا کوئی فائدہ نہیں، یہ پرلے درجے کی خود فریبی ہے۔اگر ہم اسلامی زندگی کا بیج آج نہیں بوئیں گے، جبکہ اسلام کیلئے ہمارا تحریکی جوش وخروش اپنے عروج پر ہے، تو کوئی بھی معقول آدمی اس یقین دہانی پر اعتبار نہیں کرے گا کہ جب تحریک ختم ہو جائے گی اور سیاسی آزادی مل جائے گی تو ہم یکا یک خود بخود سچے اور پکے مسلمان بن جائیں گے۔

بعض رہنما میرے اس خیال کے جواب میں کہتے ہیں: ''بھائی صاحب، تم قنوطی ہو۔ خواہ مخواہ تشویش میں مبتلا رہتے ہو۔ہم سب سچی اسلامی زندگی کے آرزومند ہیں، لیکن ابھی اسی وقت اس پر اصرار خلافِ مصلحت ہوگا۔ہماری صفوں میں بے شمار لوگ ایسے ہیں جو سیاسی میدان میں قابل قدر خدمات انجام دے رہے ہیں لیکن غلط تربیت کے باعث مذہب کی زیادہ پروا نہیں کرتے۔اگر ہم اپنی تحریک کے آغاز ہی میں اپنی جدوجہد کے مذہبی پہلو پر زیادہ زور دیں گے تو ان قیمتی کارکنوں کا جوش ٹھنڈا پڑ جائے گا جس کا ہماری جدوجہد پر بہت برا اثر پڑے گا اور یہ سراسر نقصان کی بات ہوگی۔ ہمارے نصب العین کو ضعف پہنچے گا۔ہم اپنے رضا کاروں کو کھونا نہیں

چاہتے۔ان کی خدمات سے محروم نہیں ہونا چاہتے۔ ہماری اپنی اسلامی مملکت حاصل ہونے تک ہم اپنے عوام کی مذہبی اصلاح کا کام ملتوی کرنے پر مجبور ہیں۔فی الحال ہمیں اپنی پوری توانائیاں اس جھوٹے مقصد کے حصول کے لئے وقف کر دینی چاہئیں، یعنی غیر مسلم تسلط سے مسلمانوں کی آزادی اور اپنی توانائیاں خالص مذہبی معاملات پر فی الحال خرچ نہیں کرنی چاہئیں، ایک سچی اسلامی ہیئت حاکمہ کا مقام اور مسلمانوں میں سچا مذہبی شعور بہت اہم کام ہے، لیکن یہ قیام پاکستان کے بعد شروع ہوگا۔فی الحال مغرب زدہ بھائیوں اور بہنوں کو اپنے نصب العین سے الگ کر دینے سے نقصان ہوگا بلکہ مذہب پر زیادہ زور دینے سے پاکستان کے علاقے میں رہنے والی غیر مسلم اقلیتوں کو بھی تشویش پیدا ہوگی''۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ طرزِ استدلال بالکل غلط ہے اور عقلی لحاظ سے بددیانتی۔آیئے ان حضرات کی ایک ایک دلیل پر نکتہ بہ نکتہ غور کرتے ہیں۔پہلے غیر مسلم اقلیتوں والی بات لیتے ہیں۔

جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ اسلامی طرزِ فکر وحیات پر زور دینے سے ہماری غیر مسلم اقلیتوں میں تشویش پیدا ہوگی، تو میں آپ سے پوچھتا ہوں: ''وہ کیا چیز ہے جس نے غیر مسلموں کو نظریۂ پاکستان کا سخت مخالف بنا رکھا ہے؟'' ظاہر ہے فرقہ وارانہ راج کا خوف، اس بات کا خوف کہ مسلم اکثریتی علاقے بھارت ماتا سے کٹ جائیں گے۔یہ مسئلہ غیر مسلموں کے ذہن میں پیدا ہی نہیں ہوتا کہ مسلمان اسلامی اصول واحکام کے مطابق اپنی زندگی گزارنا چاہتے ہیں یا نہیں۔وہ اگر خائف ہیں تو اس بات سے کہ بعض علاقوں میں مسلمانوں کا سیاسی اقتدار قائم ہو جائے گا۔انہیں بہ نظر ظاہر اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ مسلمان اپنے مذہب پر چلنے کی کتنی اُمنگ رکھتے ہیں اور اس پر چلنے کے کیسے عزائم رکھتے ہیں۔بعض علاقوں میں مسلم سیاسی اقتدار کے خلاف وہ ہر حالت میں اور ہر صورت میں مخالفت کریں گے اور اسے رکوانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگائیں گے۔

ہمارے حریفوں کے مخالفانہ رویے کے باوجود اگر انہیں یہ باور کرایا جائے کہ ہم مسلمانوں کا مقصد ''سب کے لیے عدل وانصاف'' کا قیام ہے تو وہ کسی حد تک اس خیال سے متأثر ہو سکتے ہیں، میں نے یہ نہیں کہا کہ وہ ضرور متاثر ہو جائیں گے، صرف یہ کہا ہے کہ متاثر ہو سکتے ہیں بشرطیکہ ہم انہیں یہ باور کرانے میں کامیاب ہو جائیں کہ ہم مسلمانوں کے مفاد کی خاطر غیر مسلموں

کا استحصال نہیں کرنا چاہتے، بلکہ ہم انسانی اخلاق کے بنیادی اصولوں کی بالادستی قائم کرنے کے متمنی ہیں۔ لہٰذا یہ ہمارا فرضِ عین ہے کہ ہم پوری دنیا پر ثابت کر دیں کہ ہم فی الواقع قرآن مجید کے ان الفاظ کے معنی ومنشا و معیار کے مطابق زندگی گزارنا چاہتے ہیں:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آل عمران:110)

''اب دنیا میں وہ بہترین اُمت تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو''۔

اللہ تعالیٰ کی نظر میں ہمارا بہترین اُمت ہونے کا انحصار اس امر پر موقوف ہے کہ ہم ہمیشہ اور ہر حالت میں انصاف کی بالادستی اور بے انصافی کے انسداد کے لئے، جدوجہد کے لئے ہمہ وقت تیار رہیں۔ غیر مسلموں کو اپنی عدل گستری کا یقین دلانے سے پہلے ہمیں ایک سچی مسلم قوم بننا پڑے گا۔ ہم بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایک غیر مسلم کو ایک ایسی ریاست میں رہتے ہوئے تشویش ضرور لاحق ہوگی جو اس کی نظر میں معاشی حقوق و مفادات میں مسلمانوں کو غیر مسلموں پر ترجیح دے گی۔ لیکن اگر اسے یقین دلایا جائے کہ وہاں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے ساتھ یکساں سلوک ہوگا تو اس کی تشویش دور نہیں ہوگی، تو اس میں کمی ضرور ہو جائے گی۔ اب یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ ہم اپنے حریفوں کو اپنی اصلی سچائیاں نہیں دکھا سکتے جب تک ہم ان پر ثابت نہ کریں، اوّل یہ کہ اسلامی حکومت کا مطلب ہے عدل سب کے لئے، دوم یہ کہ مسلمان واقعی اپنے دین کے احکامات پر قول و فعل میں سچے پیروکار ہیں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اسلامی حکومت میں عدل سب کے لئے ہوتا ہے تو ایسا ہی ہوگا۔ اس لئے یہ سمجھنا انتہائی غلط ہے کہ اگر ہم اپنے مذہبی مقاصد پر زور نہیں دیں گے اور حتی الوسع براہ راست مذہبی حوالے دینے سے احتراز کریں گے تو اس طرح غیر مسلم اقلیتوں کی تشویش دور ہو جائے گی۔ بلکہ ہمارے اس رویے سے تو انہیں یہ شبہ ہوگا کہ ہم منافقت سے کام لے رہے ہیں۔ ان کی تشویش دور یا کم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہم صاف دلی سے اور پوری تفصیلات کے ساتھ بتا دیں کہ ہمارے اخلاقی مقاصد کیا ہیں جن کے لیے ہم

جدوجہد کررہے ہیں لیکن صاف دلی سے دیے گئے بیانات سے بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ تاوقتیکہ ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں انہیں یہ مشاہدہ نہ کرادیں کہ ہمارے اخلاقی مقاصد محض نعرے نہیں ہیں، بلکہ ہمارے اخلاقی اعمال ہیں۔

عارضی قسم کے ''خلافِ مصلحت'' یا ''سیاسی تدبر'' کے نام پر (غلط فہمی سے) اپنے اصل مستقل اسلامی مقاصد سے گریز پائی ایک ایسی عاقبت نااندیشی ہے، جس سے غیر مسلموں پر تو برا اثر پڑتا ہی ہے، ہم مسلمانوں کے اخلاقی مزاج پر بھی نقصان دہ اثر پڑتا ہے اس کا نتیجہ یہ نکل سکتا ہے کہ ہم اسلام کے بتائے ہوئے راستے سے مزید دور ہوجائیں، ہم مسلمانوں کے سامنے احیائے اسلام کا جو اصل نصب العین ہے، اس کے زیادہ سے زیادہ شعور و آگہی کے بجائے ہم دوبارہ مصلحت اندیشی اور فوری آسائش کی اصطلاحوں میں سوچنے کے عادی ہوجائیں گے جیسا کہ ہم صدیوں سے اس کے عادی چلے آرہے ہیں اور یوں پاکستان کا اسلامی نصب العین یقیناً گھٹ کر صرف نظریہ پرستی بن کر رہ جائے گا جیسا کہ مغرب کی نام نہاد مسیحی اقوام میں مسیحیت کے سچے مقاصد گھٹ کر اپنی اصلیت کھو چکے ہیں۔

ہم ہرگز ایسا نہیں چاہتے۔ ہم پاکستان اس لیے بنانا چاہتے ہیں کہ اسلام کو اپنی روزمرہ کی زندگیوں میں ''حقیقت'' بنادیں، ہم پاکستان اس لیے بنانا چاہتے ہیں کہ ہم میں سے ہر ایک شخص، مرد و زن، سچی اسلامی زندگی گزار سکے۔ اور کسی فرد کے لیے اللہ اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے راستے پر زندگی بسر کرنا ممکن نہیں تاوقتیکہ پورا کا پورا معاشرہ شعوری طور پر اسلام کو ملک کا قانون و دستور نہ بنائے اور کتاب و سنت کے احکام پر صدقِ دل سے عمل نہ کرے۔

لیکن اس قسم کا اصلی پاکستان کبھی حقیقت کا جامہ نہ پہن سکے گا، تاوقتیکہ ہم اسلامی قانون کو اپنے ''غیر واضح اور مبہم'' مستقبل کے لیے اصل اصول نہ بنائیں اور ابھی اسی گھڑی، اسی گھنٹے، اسی منٹ، اسی سیکنڈ سے اسلام اور اس کے احکام کو اپنے تمام شخصی اور معاشرتی طرزِ عمل کی اساس نہ بنائیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہماری صفوں میں ایسے بہت سے لوگ موجود ہیں جو مذہب کو اس حد تک غیر اہم خیال کرتے ہیں، کہ ہم جو تحریک پاکستان کے مذہبی رخ پر اس قدر اصرار کر رہے ہیں تو ہم سے ناراض ہوجائیں گے۔ اگرچہ دوسری طرف یہ بات بھی ہے کہ اگر انہیں یہ

احساس دلا دیا جائے کہ مسلم قوم بہ حیثیت مجموعی اسلام کی جانب پیش قدمی کرنے کا عزمِ صمیم کر چکی ہے تو مذہب سے بے زار یہ لوگ بہت جلد جماعت کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیں گے۔ بہر صورت ان کی ذاتی ترجیحات کی زیادہ پرواہ نہیں کرنی چاہیے اور ہمارے عزم کی راہ میں ان کی بے عزمی کو راہ نہیں ملنی چاہیے۔ کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کفارِ قریش کی ناراضی سے بچنے کے لیے اور اس انتظار میں کہ ایک روز وہ اسلامی ریاست کی تشکیل و تعمیر میں معاون و مددگار ثابت ہوں گے، ایک دن کے لیے بھی اسلامی مقاصد کی تحصیل و تکمیل کو ملتوی کر دیتے؟

آپ اس کے جواب میں زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ ''رسول ﷺ تو آخر رسول ﷺ تھے ان کے لیے مصلحت کوشی کو نظر انداز کرنا ممکن تھا۔ ہم تو عام سے فانی بندے ہیں۔'' اس کے جواب میں، میں آپ سے پوچھوں گا کہ کیا آپ اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر یقین رکھتے ہیں:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (سورہ احزاب: آیت 21)

ترجمہ: ''درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسول ﷺ میں ایک بہترین نمونہ تھا''

کیا یہ حکم ربانی آپ کی سیاست اور آپ کی دعاؤں، آپ کے ذاتی حالات و تفکرات اور آپ کی اجتماعی و معاشرتی زندگی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا؟

پس چہ باید کرد

یہ سوچ ہماری روحانی ژولیدگی کی علامت ہے، اور اس کی بڑی وجہ صدیوں سے چلے آنے والا ہمارا زوال ہے کہ کوئی سیاسی تحریک جو بیک وقت اسلامی تجدید و احیا کا بھی دعویٰ کرے، وہ اپنے اصل مقصد سے منحرف ہونے کے باعث ضرور ناکام ہو جاتی ہے اور گھٹ گھٹا کر مصر، ترکی اور شام جیسے ملکوں کی ''قومی تحریک'' بن جاتی ہے۔ ہمارے اکثر و بیشتر لیڈروں کا غالب رجحان طبع یہ ہے کہ وہ ہماری جدوجہد کے روحانی اسلامی پس منظر کو تو (غالباً دانستہ) نظر انداز کر دیتے ہیں اور مسلمانوں کے مطالبہ آزادی کے جواز میں ہندو اکثریت کے ساتھ ان کے تلخ تجربات پیش کرنے کے پہلو بہ پہلو ہندوؤں کے سماجی رسوم و روایات اور ثقافتی مظاہر سے مسلمانوں کے اختلافات بیان کر کے ایک ''جداگانہ قوم'' ثابت کرنے پر زورِ بیان صرف کر دیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ جداگانہ

مسلم قومیّت کی حقیقت پر (اور بلاشبہ یہ حقیقت ہی ہے) لفظ ''قومیّت'' کے مغربی مفہوم میں باتیں کرنے کا رجحان بڑھتا چلا جارہا ہے، بجائے اس کے کہ لفظ اُمت یا ملت کے اسلامی مفہوم میں ''جداگانہ مسلم قومیّت'' کے مفہوم کی تشریح کی جائے۔ ہمیں بلاخوف وخطر، بانگ دہل، ڈنکے کی چوٹ پر یہ اعلان کرنے میں ہچکچاہٹ کیوں ہے کہ لفظ ''قوم'' کے رواجی مفہوم سے ہمیں کوئی نسبت نہیں ہے۔ ہاں ہم ایک قوم ہیں لیکن محض اس لیے نہیں کہ ہماری عادات، ہمارے رسم ورواج، ہمارے ثقافتی مظاہر اس ملک میں بسنے والی دوسری قوموں سے مختلف ہیں بلکہ ہم اس مفہوم میں ایک قوم ہیں کہ ہم اپنے ایک خاص نصب العین کے مطابق اپنی زندگیاں ڈھالنا چاہتے ہیں۔

اسلام سے وابستہ ہونا ہی ہمارے جداگانہ تشخص کا واحد جواز ہے۔ ہم کوئی نسلی وحدت نہیں ہیں، ہم لسانی وحدت بھی نہیں ہیں، حالانکہ اُردو مسلمانانِ ہند کی زبان کی حیثیت سے بڑی ترقی یافتہ زبان ہے۔ ہم انگریزوں یا عربوں یا چینیوں کی طرح 'قوم' نہیں ہیں اور نہ کبھی اس مفہوم میں قوم بن سکتے ہیں اور یہی ایک حقیقت کہ ہم لفظ ''قوم'' کے روایتی ورواجی مفہوم میں نہ تو قوم ہیں اور نہ قوم بن سکتے ہیں، ہماری اندرونی قوت کا بہت بڑا سرچشمہ ہے۔ کیونکہ اس حقیقت کی بنیاد پر ہمیں یہ شعور حاصل ہوتا ہے کہ پورے کرۂ ارض پر، پوری دنیا میں، ہم، فقط ہم، بشرطیکہ ہم ایسا چاہیں، اس شاندار منظر میں حیاتِ نو پیدا کر سکتے ہیں جو چودہ سو سال پہلے عرب کے صحراؤں سے اُٹھا تھا، ایسے آزاد مردوں اور عورتوں کی ایک اُمت کا شاندار منظر جو نسل، زبان اور وطن کے اتفاقی وحادثاتی بندھنوں کے باعث متحد و یک جان نہیں ہوئے تھے، بلکہ ایک مشترکہ نصب العین سے اپنی باشعور اور آزادانہ وفاشعاری کے باعث متحد و متفق ہوئے تھے۔

بدقسمتی سے ہمارے صف اوّل کے اکثر رہنما مسلمانوں کے اس گم کردہ راہ اور تشکیک پسند طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جن کے نزدیک اسلام ''ثقافتی روایت'' کے سوا کچھ نہیں اور یوں پاکستان بھی ان کے خیال میں محض اس راہ کا ایک نشان ہے، پہلا قدم سہی، جس پر نام نہاد ''ترقی یافتہ'' مسلم اقوام دیر سے چلتی آرہی ہیں یعنی بہ تمام وکمال قومیّت کی راہ۔ ہماری جدوجہد کے اسلامی پہلو پر یہ رہنما کبھی کبھار زبانی کلامی کچھ کہہ بھی لیتے ہیں لیکن فی الحقیقت اسلام کے مذہبی اصولوں کے مطابق مسلمانوں کی ذاتی واجتماعی زندگی ڈھالنے کی طرف اشارے کنایے میں بھی بات نہ

کرنے کو ''جدیدیت'' خیال کرتے ہیں۔ پاکستان کے مطالبے کو بھی اسلامی مقاصد سے ہم آہنگ کرنے میں انھیں عار محسوس ہوتی ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ نیم دلانہ رویہ تحریک پاکستان کے بدن سے سب سے متحرک اور فعال عنصر یعنی روحانی عنصر کو نکال دیتا ہے اور یہ چیز پاکستان کے مستقبل کے لیے اتنا بڑا خطرہ ہے کہ باہر کی کوئی مخالفت اس خطرے کی پاسنگ بھی نہیں ہے۔

عظیم اقوام کے مقدر کا انحصار اس بات پر نہیں ہوتا کہ ان کی پڑوسی اقوام اصولاً ان کے اغراض و مقاصد سے اتفاق یا اختلاف کرتی ہیں، ان کے مقدر کا انحصار ان کے اغراض و مقاصد کی روحانی طاقت (یا کمزوری) پر ہوتا ہے۔ اگر پاکستان کے لیے ہماری آرزو نتیجہ ہے ہماری تخلیقی قوت اور ہمارے قلبی خلوص کا، اگر منزلِ مقصود پر پہنچنے سے پہلے ہی اس کے منظر کے بارے میں ہماری بصارت واضح اور ہماری بصیرت پاکیزہ ہے، اگر مقصد کو مقصد بالذات جان کر اس سے محبت کرنے کا سلیقہ سیکھ لیں، اس عقیدے کے ساتھ کہ اپنے مطلقہ مفہوم میں یہ خیر اعلیٰ ہے (یا یوں کہیے کہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں خیر اعلیٰ ہے) اور محض اس لیے خیر نہیں ہے کہ بہ نظر ظاہر ہمارے لیے اور ہماری قوم کے لیے معاشی طور پر فائدہ رساں ہے۔ تب دنیا کی کوئی طاقت ہمیں پاکستان بنانے سے نہیں روک سکتی جو دنیا بھر میں تجدید و احیائے اسلام کا دروازہ کھول دے گا۔

اور اس کے برعکس اگر خود اختیاری کے لیے ہمارا مطالبہ نتیجہ ہے غیر مسلم اکثریت کے تسلط کے خوف کا، اگر ہمارے ذہن پر مستقبل کی تصویر کا محض نگیٹو ثبت ہے، اگر یہ کسی بلند و بالا چیز کی خاطر آزاد ہونے کی آزادانہ آرزو نہیں ہے، اگر یہ صرف کسی چیز سے آزاد ہو جانے کی گداگرانہ خواہش ہے، اگر اسلام ہمارے لیے مقصود بالذات اور ایک اخلاقی داعیہ نہیں ہے، اگر اسلام ہمارے لیے محض ایک عادت، ایک رسم، ایک ثقافتی ٹھپہ بن کر رہ گیا ہے، تب ایسی صورت میں یہ تو ممکن ہے کہ ہم اپنی عددی طاقت کے بل پر پاکستان کی قسم کی کوئی چیز حاصل کر لیں، لیکن ایسا پاکستان اس پاکستان کے برابر نہ ہوگا، جسے حاصل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہمیں بے حد و شمار امکانات سے نوازا ہے۔ ایسا پاکستان بے شمار قومی ریاستوں کے منقسم ہجوم میں ایک اور ''قومی ریاست'' سے زیادہ کچھ نہ ہوگا۔ بہت سی ریاستوں سے اچھا، بہت سی ریاستوں سے برا۔ مسلم عوام کے تحت الشعور میں بسا ہوا خواب، اور ان لوگوں کے شعور میں آیا ہوا خواب جنھوں نے پہلے پہل

پاکستان کی باتیں اس وقت کیں، جب یہ نام بھی پردۂ شہود میں نہ آیا تھا، وہ خواب کیا تھا؟ ایک ایسی ہیئت حاکمہ کا قیام جس میں رسول کریم ﷺ کے اُسوۂ حسنہ اور سنت کو ہر قدم پر، ہر پہلو سے عملی حقیقت کا جامہ پہنایا جاسکے۔

فیصلے کی گھڑی آن پہنچی ہے

اگر ہمارے موجودہ رہنما ہمارے عوام کی دل کی دھڑکنیں سن سکیں تو انہیں یقیناً احساس ہوجائے گا کہ عام مسلمان محض ایک ایسی نئی ریاست کا خواب نہیں دیکھتا، جس میں مسلمانوں کو موجودہ معاشی مراعات سے کچھ زیادہ حاصل ہوسکیں۔ وہ تو ایک ایسی ریاست کا خواب دیکھ رہا ہے جس میں احکامِ الٰہی کی فرماں روائی ہو۔ ایسا نہیں ہے کہ عام آدمی مراعات وسہولیات کی پروا نہ کرتا ہو، وہ یقیناً پروا کرتا ہے، بہت زیادہ کرتا ہے۔ معاش ہر شخص کی بنیادی ضرورت ہے۔ لیکن وہ محسوس کرتا ہے اور بجا طور پر محسوس کرتا ہے کہ ایک سچی اسلامی ریاست میں اسے نہ صرف معاشی انصاف اور مادی ترقی کا مساوی موقع ملے گا، جو فی الوقت اسے حاصل نہیں ہے، بلکہ اس کے انسانی وقار اور اس کے روحانی استحکام میں بھی قابل قدر اضافہ ہوگا۔

ہمارے عام آدمی کا یہ احساس، یہ امید، یہ آرزو، یہ خواب، جیسا کہ میں پہلے بھی بیان کرچکا ہوں، منتشر ہے، بکھرا ہوا ہے، الجھا ہوا ہے۔ یہ عقلی نہیں، جبلی ہے۔ ہمارے عوام کے ذہن صاف نہیں ہیں کہ نئی اسلامی ریاست، جس کے لیے وہ جدوجہد کررہے ہیں، اپنے قیام کے بعد کیسی اور کس شکل وصورت کی ہوگی۔ وہ پوری طرح نہیں جانتے کہ اس ریاست کے قیام کے لیے انہیں کیا ایثار کرنا ہوگا، اور کیا قیمت ادا کرنا ہوگی اور کیا قربانیاں کس کس شکل میں دینی پڑیں گی۔ وہ صاف دل اور صاف ذہن ہو بھی کیسے سکتے ہیں؟ صدیوں سے ان کا رشتہ اسلامی تعلیمات سے کٹا ہوا ہے۔ صدیوں سے وہ جہالت، ضعیف الاعتقادی اور سیاسی تذلیل کے ڈونگے کنوئیں میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اس لیے اس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ وہ صرف نعروں اور زبانی کلامی وعدوں پر تکیہ کرتے ہیں۔ اس میں حیرت کی کیا بات ہے کہ وہ اپنے باطن میں چھپی ہوئی خواہشوں، اپنے دل میں پوشیدہ ارمانوں اور اپنے ذہن کے لاشعوری خوابوں کے درمیان کوئی ربط پیدا نہیں کرسکتے اور انہیں ان کے اظہار پر قدرت حاصل نہیں ہے۔ وہ محسوس تو کرتے ہیں، لیکن

انہیں اپنے محسوسات کے اظہار کا سلیقہ نہیں آتا۔ وہ یہ تو جانتے ہیں کہ انہیں ان کی خواہشات، محسوسات اور خوابوں سمیت آتش فشانی جہنم میں جلنے کو ڈال دیا گیا ہے، لیکن یہ نہیں جانتے کہ اس جہنم سے نکلنے کا راستہ کیا ہے۔ یہ راستہ جاننے کے لیے روحانی قیادت کی ضرورت ہے، جس کی اہمیت سیاسی قیادت سے کم نہیں۔

ہمارے رہنماؤں کے سامنے اصل کرنے کا کام کیا ہے؟ ہمارے عوام کے خوابوں اور خواہشوں کو ایک تخلیقی اور مثبت رُخ پر منظّم کرنا، ان میں اسلام کی روح سمونا۔ ان کی تنظیم صرف سیاسی طور پر نہیں، بلکہ پاکستان کے عظیم تر مقصد کی خاطر روحانی اور نظریاتی طور پر بھی کی جائے۔ انہیں صرف اس پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے کہ انہیں ایک جماعت میں منظّم کر دیا جائے اور ان کے سیاسی مطالبات کو زبان دے دی جائے۔ ملت ان سے کچھ اور بھی تقاضا کرتی ہے۔ بلاشبہ تنظیم کی سخت ضرورت ہے۔ سیاسی احتجاج بھی ایک ضرورت ہے۔ لیکن یہ تمام ضرورتیں ہمارے نظریاتی مقصد کے حصول کی خاطر ہونی چاہئیں، نہ کہ جیسا کہ آج کل دیکھنے میں آ رہا ہے، یہ دوسرے تیسرے درجے کی چیزیں بن کر رہ گئی ہیں۔ ایک مسلمان کے نزدیک، جس کے لیے اسلام ہی اس کا جینا مرنا ہے، ہر سیاسی تحریک کو اپنی سند جواز مذہب سے حاصل کرنی چاہیے، کیونکہ مذہب سیاست سے الگ نہیں ہوسکتا، اور اس کی وجہ بڑی سادہ ہے، یہ کہ اسلام صرف ہماری روحانی ارتقاء سے غرض نہیں رکھتا، بلکہ ہماری جسمانی، معاشرتی اور اقتصادی زندگی سے بھی پورا پورا تعلق رکھتا ہے۔ اسلام ہمارا مکمل ضابطہ حیات ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان کے لیے، پاکستان کی حمایت میں، پاکستان کی خاطر مسلم عوام سے مسلم رہنما جو پرزور اپیلیں کرتے رہتے ہیں، ان کا پہلا حوالہ پاکستان میں اسلام کا دینی و مذہبی پہلو ہونا چاہیے۔ اگر اس اندرونی آواز اور مطالبے کو نظر انداز کیا گیا، تو ہماری جدوجہد اپنے تاریخی مشن کو پورا نہ کر سکے گی۔

ہمارے لیڈروں کے لیے اسلامی و نظریاتی قیادت کی ضرورت آج کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اگر سب رہنما نہیں تو گنتی کے چند رہنما ایسے ضرور موجود ہیں جو وقت کی اس اہم ضرورت سے پوری طرح باخبر بھی ہیں اور اس ذمہ داری سے پوری طرح عہدہ برآ بھی ہو رہے ہیں، مثال کے طور پر چند ماہ قبل مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے شاندار جلسہ تقسیم اسناد کے موقع پر

قائداعظم کے دست راست لیاقت علی خان صاحب نے جو خطبہ صدارت پیش کیا، انہوں نے بڑے زوردار طریقے سے اس حقیقت کو اجاگر کیا کہ تحریک پاکستان کے محرکات کا اصل سرچشمہ قرآن مجید ہے، لہٰذا ہم جس اسلامی ریاست کے قیام کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں، وہ اپنی سند اختیار و مجاز صرف شریعت سے حاصل کرے گی۔ قائداعظم محمد علی جناح نے بھی متعدد موقعوں پر ایسے ہی انداز فکر میں خطاب کیا ہے۔ ایسے بیانات و خطبات چونکہ مسلم لیگ کی ہائی کمان کی طرف سے آتے ہیں، اس لیے مسلم لیگ کے مقاصد و اغراض کی تشریح و ترجمانی ہو جاتی ہے، لیکن محض تشریح و ترجمانی کافی نہیں۔ اگر مسلم لیگ کے اسلامی اغراض و مقاصد کو ہماری سیاست پر عملاً اثر انداز ہونا ہے تو مسلم لیگ کی ہائی کمان کو زیادہ ٹھوس بنیاد پر وضاحت و تشریح کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ اس کام کی خاطر ارباب دانش کی ایک بااختیار مجلس بنانی چاہیے جو ان اصولوں کی مناسب وضاحت و تشریح کرنے کا فریضہ انجام دے جن پر پاکستان کی بنیاد استوار کی جائے گی۔

چند سال پہلے تک اس کام کی ضرورت اتنی شدید نہ تھی، کیونکہ اس وقت ہماری سیاسی منزلِ مقصود بھی واضح نہ تھی، لیکن جیسا کہ آج کل کے حالات کا تقاضا ہے، ملک میں ایسی زبردست تبدیلیاں پے بہ پے آ رہی ہیں جن کے سبب مستقبل قریب میں پاکستان کا حصول و قیام ایک ممکن العمل چیز نظر آ رہا ہے۔ اب یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ جون 1948ء سے پہلے پہلے پاکستان نام کی ایک نئی آزاد اور خودمختار ریاست کسی نہ کسی شکل میں وجود میں آ جائے گی۔ یہی ہے وہ نکتہ جو میں آپ کے ذہن نشین کرانا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا ہے ''کسی نہ کسی شکل میں'' ____ اب یہ فیصلہ کرنا ہمارا کام ہے اور یہ ہمارے ہاتھ میں ہے کہ پاکستان کی شکل کیسی ہو۔ اسی لیے میں کہا کرتا ہوں کہ یہ سوال کہ ''کیا ہم واقعی اسلام چاہتے ہیں؟'' اب محض نرے غور و فکر کے صاف ستھرے شعبے سے نکل کر فوری نوعیت کی عملی سیاست میں داخل ہو گیا ہے اور پوری شدت سے پوچھ رہا ہے: ''کیا ہم واقعی اسلام چاہتے ہیں؟''

یہ عین ممکن ہے کہ اس مضمون کے شائع ہونے سے پہلے ہی قائداعظم نے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی قائم کرنے کا مژدہ مسلمانانِ ہند کو دے دیا ہو اور اگر ابھی تک ایسا نہ ہو سکا ہو تو بہت جلد اس کا اعلان منظر عام پر آ جائے گا۔ لہٰذا مسلمان واضعین قانون اور اربابِ دانش کو فوراً ذہنی طور

پر خود کو تیار کر لینا چاہیے کہ نئی اسلامی ریاست کا سیاسی نظام کیا ہوگا، کس نوعیت کا معاشرہ استوار کرنا ہوگا، اور قومی مقاصد کیا ہوں گے۔ ان کے سامنے جو مسئلہ درپیش ہے وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل سادہ ہے: ''کیا ہماری ریاست مذہب سے عالمی دوری کی ایک اور علامت ہوگی، ان مسلم ریاستوں میں ایک اور مسلم ریاست کا اضافہ، جن میں اسلام کا کوئی اثر اور عمل دخل نہیں ہے نہ سیاسی نظام کی تشکیل میں نہ معاشرتی طرزِ عمل میں۔ یا پھر یہ جدید تاریخ میں ایک نہایت پر جوش اور انتہائی شاندار تجربہ ہوگا، اس شاہراہ پر پہلا قدم جو انسانِ کامل ﷺ نے پوری انسانیت کو دکھائی تھی؟ کیا پاکستان برعظیم ہندوستان کے چند خاص علاقوں میں مسلمانوں کی قومی ترقی کا ایک ذریعہ ہوگا، یا پھر پاکستان ایک عملی سیاسی نظریے کے طور پر پوری دنیا میں اسلام کی تجدید و احیا کی علم برداری کرے گا؟

اگر کبھی کسی قوم کے سامنے فیصلے کی گھڑی آیا کرتی ہے کہ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں شعوری فیصلہ کرے، تو مسلمانانِ ہند کے لیے فیصلے کی گھڑی آ گئی ہے۔ اب یہ ذمہ داری ہمارے رہنماؤں کے کندھوں پر ہے کہ وہ فیصلہ کریں اور صحیح فیصلہ کریں۔

اس سے پہلے کبھی مسلم رہنماؤں کو ایسا اختیار تفویض نہیں ہوا کہ وہ ملت کی تقدیر کا فیصلہ صحیح (یا غلط) سمت میں کریں۔ یہ ان کے اختیار و طاقت میں ہے کہ وہ جلد از جلد اپنا فیصلہ سنائیں کہ ہندی مسلمان صحیح معنی میں مسلمان اور حیات نو پانے والے اسلام کی پشت پناہ بن جائیں گے، یا پھر نام نہاد مسلمان گروپوں اور ریاستوں کے ہجوم میں ایک اور مسلمان گروپ اور ریاست کا اضافہ ہو جائے گا، جہاں اسلام کی حیثیت ایک ثقافتی ٹھپّے سے زیادہ نہیں، جہاں اسلام اور اس کے اصول و احکام امت المسلمین کے معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی وجود کے لیے ناگزیر خیال نہیں کیے جاتے۔ مسلم لیگ کی موجودہ قیادت، میں پھر دہراتا ہوں، مسلم لیگ کی موجودہ قیادت کے ہاتھ میں ہے فیصلہ کرنا، صحیح فیصلہ کرنا، کیونکہ حصولِ پاکستان کے لیے جوش و خروش کی جو زبردست لہر اُٹھی ہے، وہ مسلم لیگ نے اٹھائی ہے، اور اس نے اس ملک کے تمام مسلم عوام کو اٹھا دیا ہے، انہیں متحد کر دیا ہے، اور ایسا متحد کیا ہے کہ اس سے پہلے کبھی ماضی کی تاریخ میں اتحاد کا ایسا شاندار مظاہرہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ اور جوش و خروش کی اس لاثانی لہر نے ہمارے رہنماؤں کو مسلمانوں کی قیادت کے

لیے ایسی باوقار طاقت تفویض کی ہے، جو گزشتہ کئی صدیوں کے دوران میں کسی قوم نے اپنے رہنماؤں کو کبھی تفویض نہ کی تھی۔ گویا اسی بااختیار وقار و طاقت کی بنا پر ان کی اخلاقی ذمہ داری بھی بہت زیادہ ہے۔ انہیں یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ ان کی ذمہ داری ''سیاسی تدبر'' سے شروع اور ''سیاسی تدبیر'' پر ختم ہو جاتی ہے۔ سیاسی تدبیریں خواہ کتنی بھی ضروری اور ناگزیر ہوں، یہ محض ثانوی نوعیت کی ہوتی ہیں اور لیڈروں کے فرائض میں ایک عبوری اور عارضی مرحلے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لیڈروں کا اصل منصب و فریضہ ''قوم سازی'' ہے۔ چونکہ ہماری قومیّت کی بنیاد اسلام ہے، اس لیے ہمارے لیڈروں کو فوراً اسلام کی اصطلاحوں میں سوچنا شروع کر دینا چاہیے، کیونکہ مستقبل کے لیے افکار تازہ کی نمود کو ملتوی کیے جانا اب کسی اعتبار سے مناسب نہیں (یہ سوچنا اور کہنا اب غلط اندیشی ہے کہ ''ایسے امور و معاملات پر اس وقت غور کیا جائے گا جب پاکستان قائم ہو جائے گا۔'') ہمارے لیڈروں کو اسلام کے تقاضوں اور مسلم قوم کے عارضی مفادات کے درمیان خیالی خط نہیں کھینچنا چاہیے کیونکہ اسلام کے تقاضے جامع اور ہمہ گیر ہیں، ان میں مسلمانوں کے روحانی معاملات بھی شامل ہیں اور معاشی مفادات بھی۔ اسلام کے تقاضوں کے آگے مکمل، رضا کارانہ اور باشعور دست برداری واحد حل ہے۔

مختصر یہ کہ اب یہ ہمارے سیاسی رہنماؤں کا فرض ہے کہ وہ عوام کو بار بار تلقین کریں کہ حصولِ پاکستان کا مقصد ایک سچی اسلامی ہیئت حاکمہ کا قیام ہے، اور یہ مقصد کبھی حاصل نہیں ہوسکتا، جب تک تحریک پاکستان کا ہر کارکن، وہ مرد ہو عورت، بڑا ہو یا چھوٹا، دیانت داری سے اپنی زندگی کو ہر گھنٹے اور ہر منٹ اسلام کے قریب سے قریب تر لانے کی کوشش نہ کرے گا، کیونکہ ایک اچھا مسلمان ہی اچھا پاکستانی بن سکتا ہے۔

ہمارا اخلاقی قد و قامت

یہ بات جہاں عامۃ المسلمین پر صادق آتی ہے، وہاں ہمارے لیڈروں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ انہیں اپنے معاشرتی رویے سے یہ ظاہر و ثابت کرنا ہوگا کہ وہ پوری سنجیدگی سے اسلام کو ایک سچا اصول و نظریہ قرار دیتے ہیں اور اسے محض ایک نعرہ نہیں سمجھتے۔ سادہ لفظوں میں یوں کہیے کہ وہ اسلام کے عین تقاضوں کے مطابق زندگی گزارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یقیناً

ہمارے لیڈروں میں بہت سے ایسے بھی ہیں جن کے نزدیک اسلام ایک زندہ محرک ہے، اوران کے لیے اظہارِ خلوص وعقیدت ہم پر واجب ہے لیکن بہت سے ایسے بھی ہیں جن کی صرف زبان پر اسلام کا نام آتا ہے، اور وہ بھی اس وقت جب وہ کسی عوامی جلسے سے خطاب کررہے ہیں یا کوئی اخباری بیان ان کی طرف سے جاری ہوتا ہو۔ حالانکہ ان کا شخصی وظاہری رویہ اسلام سے اسی طرح خارج ہوتا ہے جس طرح یورپ اور امریکہ کے کسی عام سیاسی لیڈر کا شخصی وظاہری رویہ عیسائیت سے خارج ہوتا ہے۔ اگر حصولِ پاکستان کی خاطر ہماری جدوجہد کو اس مرض ''قومیّت'' کی قابل رحم حالت میں ضائع نہیں ہونا ہے، جس میں پوری دنیائے اسلام مبتلا ہے، تو ہمارے لیڈروں کا رویہ فوراً بدل جانا چاہیے۔ اگرچہ یہ ہمارا کام نہیں ہونا چاہیے کہ کسی شخص کے ذاتی عقائد کے نگران ومنصف بن جائیں، کیونکہ یہ صرف اللہ کا کام ہے، تاہم ملت کو اپنے رہنماؤں سے یہ توقع کرنے کا حق حاصل ہے کہ ان کا طرزِ زندگی اس نظریے کے عین مطابق ہے، جس کے تحفظ کا وہ اپنی زبان سے دعویٰ کرتے ہیں۔

آخر میں ایک اور بات۔ اگر ہمارے لیڈر اسلامی شعور وآگہی کی اعلیٰ ترین بلندیوں پر پہنچ جائیں، تب بھی صرف ان کی مثال ہمارے روحانی مقصد کے حصول وتحفظ کے لیے ناکافی ہوگی۔ ہماری قوم کو اخلاقی ومعاشرتی زوال کے اس گڑھے سے نکل کر اٹھنا ہوگا، جس میں وہ گری پڑی ہے۔ ہمارا موجودہ اخلاقی قدوقامت اس معیار سے بہت نیچے ہے جس کا تقاضا اسلام ہم مسلمانوں سے کرتا ہے۔ تہذیب کی روح کا ہم میں فقدان ہے، آرام طلبی اور تن آسانی سے ہمیں محبت ہے، جب ذاتی مفاد کی کوئی بات سامنے آئے تو ہمیں جھوٹ بولنے سے عار نہیں، ہمیں اپنے وعدے وعید توڑنے میں مزا آتا ہے، جب بدعنوانی، خودغرضی، چال بازی، فریب کاری کے واقعات ہماری روزمرہ کی زندگی کے مشاہدے میں آتے ہیں تو ہم بڑی معنویت سے مسکراتے یا بڑی ڈھٹائی سے ہنستے ہیں۔ ہمارے معاشرے کے بیشتر افراد کو کسی چیز سے کوئی سچی لگن ہے، تو وہ چیز وہ ہے جسے عرف عام میں ''کیریئر'' کہتے ہیں۔ اپنے لیے اور اپنے رشتہ داروں کے لیے چھوٹے سے چھوٹے فائدے کے لیے وہ سب کچھ کرگزرتے ہیں، جو ان سے ہوسکتا ہے۔ اپنے مسلمان بھائیوں کی پیٹھ پیچھے غیبت کرنا اور بہتان لگانا ہمارا قومی شعار بن چکا ہے۔ مختصر یہ کہ ہم نے اپنے

وجود کے اصل سرچشمے یعنی اسلامی تعلیمات سے فیضیاب نہ ہونے کی قسم کھا رکھی ہے۔

ایسے حالات میں ہم کیونکر ایک سچے اسلامی ملک پاکستان کے شایانِ شان سچے شہری بن سکتے ہیں؟ ایسے حالات میں ہم کیونکر ایسا سچا اسلامی ملک پاکستان حاصل کر سکتے ہیں، جس کے حصول کی خاطر ہم اپنی موجودہ اخلاقی پستی سے اوپر اٹھنے کی ذرا بھی کوشش نہ کریں؟ جب ہمارے دل میں حب الٰہی اور خوفِ خدا ہی موجود نہ ہو، تو ہم کیونکر حکم الٰہی کو اپنے معاشرتی نظام کا مقتدر بنا سکتے ہیں؟ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ان سوالوں کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ اگر مسلمان اپنے طور طریق اور اپنے اخلاقی معیار فوری طور پر تبدیل نہیں کریں گے اور ہر قدم پر شریعت کے احکام کی خلاف ورزی کی روش ترک نہیں کریں گے، تو یقین جانئے کہ نظریۂ پاکستان میں سے اس کی روح غائب ہو جائے گی اور یوں پاکستان کو اسلام کی جدید تاریخ میں جو منفرد پوزیشن حاصل ہونے والی ہے، وہ حاصل نہ ہو سکے گی۔

جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں، اور اب پھر کہتا ہوں کہ عامّۃ المسلمین جبلی طور پر پاکستان کی اسلامی روح کا احساس رکھتے ہیں، اور دل و جان سے چاہتے ہیں کہ ''لا الٰہ الا اللہ'' پاکستانی قوم کی ترقی و تعمیر کے لیے نقطۂ آغاز بن جائے، لیکن ان کے خیالات میں اِبہام اور ژولیدگی ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ جانا کدھر کو ہے۔ انہیں رہنمائی کی ضرورت ہے۔ رہنمائی رہنما کا منصب ہے۔ سوال گھوم پھر کر پھر قیادت کا سامنے آ گیا ہے۔

مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ عصر حاضر کی مسلم قیادت کا بڑا امتحان یہ ہے کہ وہ اپنی قوم کی رہنمائی صرف سیاست و معیشت کے میدان میں نہ کریں، بلکہ روحانی اور اخلاقی میدان میں بھی کریں اور مسلمانوں کو باور کرائیں کہ:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (سورہ رعد: آیت 11)

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی قوم کی سیاسی و معاشی حالت بہتر نہیں ہو سکتی جب تک اس کی مجموعی اخلاقی حالت بھی بلند نہ ہو۔

افغان باقی کوہسار باقی
الحکم للہ ، الملک للہ

ابو فیصل محمد منظور انور

؎ نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

امریکہ میں 9/11 کے واقعہ کے بعد شروع ہونے والی افغانستان میں جاری جنگ بالآخر اپنے انجام کو پہنچ گئی۔ گزشتہ 21 سال سے جاری افغان جنگ میں امریکہ اور اس کی اتحادی نیٹو افواج نے لاکھوں بے گناہ اور نہتے مسلمانوں کو شہید کیا۔ جنگ کی اصل وجہ بظاہر القاعدہ تنظیم کے امریکہ پر نائن الیون کے حملے تھے جس کے سربراہ عرب مجاہد اسامہ بن لادن تھے جو اس وقت افغانستان میں طالبان کی حکومت کے ساتھ موجود تھے۔ امارتِ اسلامی افغانستان دنیا کی واحد اسلامی حکومت تھی جو طالبان مجاہدین کے امیر ملا محمد عمر رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں قرآن وسنت کی روشنی میں شریعت محمدی کے مطابق کامیابی کے ساتھ چلائی جا رہی تھی یہ بات لادینیت کے حامل ملک امریکہ اور عالم کفر کو گوارا نہ تھی۔ نیویارک میں ٹوئن ٹاورز کی ائیر اٹیک کے ذریعے تباہی ایک ڈرامہ تھی۔ جنرل حمید گل مرحوم نے ایک موقع پر تاریخی الفاظ کہے تھے: ''نائن الیون بہانہ، افغانستان ٹھکانہ اور پاکستان نشانہ''۔ کیونکہ ایٹمی پاکستان عالم کفر کی آنکھوں میں کھٹکتا ہے۔ نائن الیون واقعہ کی حقیقت پر شکوک وشبہات بارے امریکہ اور دنیا میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ بالآخر امریکا نے افغانستان میں اپنی ناکامی کا مبینہ اعتراف کرتے ہوئے جنگ کے خاتمے اور افواج کی واپسی کا فیصلہ کر لیا۔ جدید سائنس وٹیکنالوجی کی برتری کی حامل عالمی طاقت امریکہ کے لیے یہ جنگ اس

کے گلے میں پھنسی ایسی ہڈی بن گئی تھی جسے وہ نہ نگل سکتا تھا اور نہ ہی اگل سکتا تھا۔ پہلے امریکی صدر مسٹر ٹرمپ نے امسال مئی میں فوجوں کی واپسی کا اعلان کیا تھا مگر جو بائیڈن نے بعد میں اعلان کیا کہ رواں سال 11 ستمبر تک تمام امریکی فوجی دستے افغانستان سے واپس بلا لیے جائیں گے۔ تاہم افغان طالبان کی پے در پے فتوحات نے امریکی قیادت کو اس قدر خوفزدہ کر دیا کہ وہ گھبراہٹ اور سراسیمگی کا شکار ہو کر پہلے ہی افغانستان میں اپنا سب سے بڑا فوجی اڈہ (بگرام) رات کے اندھیرے میں بند کر کے چوری چھپے نکل گئے۔ گزشتہ سال امریکہ اور طالبان کے مابین معاہدے میں جنگ افغانستان کے خاتمے کا باقاعدہ اعلان کیا گیا تھا۔ کابل سے تقریباً 60 کلومیٹر کے فاصلے پر موجود بگرام ایئربیس سے امریکی افواج کی وطن واپسی افغانستان میں امریکی جنگ کے خاتمے کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ نیٹو کی مسلح افواج اسی ایئربیس سے ہی یہاں کی اپنی تمام تر کارروائیاں کرتی تھی افغانستان پر قبضے کے لئے امریکہ نے طالبان مخالف مقامی دھڑوں کو منظّم کرنے کے لیے اپنی اسپیشل فورسز اور سی آئی اے ایجنٹ افغانستان میں داخل کئے تھے جن کی اطلاعات اور خفیہ رپورٹ پر بمباری کی جاتی تھی۔ 7/اکتوبر 2001ء میں امریکی فوج نے طالبان اور القاعدہ پر فضائی حملوں کا آغاز کیا۔ 13 نومبر 2001ء امریکا کے حمایت یافتہ شمالی اتحاد کی فوجیں کابل میں داخل ہو گئیں۔ تقریباً ایک مہینے کی لڑائی کے بعد طالبان پسپا ہو کر جنوب کی طرف چلے گئے۔ امریکہ نے دو سال تک وحشیانہ بمباری کر کے نہتے عوام اور ان کے گھروں کو تباہ و برباد کیا۔ 2 مئی 2003ء امریکی حکام نے افغانستان میں اہم جنگی آپریشنز کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ 5 دسمبر 2001ء کو حامد کرزئی ایک مہرہ تلاش کر کے عنانِ حکومت اس کے سپرد کر دی گئی۔ اسی دوران صدر جارج ڈبلیو بش کی زیر قیادت امریکا کی توجہ اس وقت عراق پر حملے کے لیے تیاریوں پر تھی۔ اس لئے امریکی فوج اور جنگی ساز و سامان بڑے پیمانے پر وہاں منتقل کیا گیا۔ اس طرح طالبان کو دوبارہ منظّم ہونے کا موقع ملا تو انھوں نے ملک کے جنوبی اور مشرقی علاقوں میں اپنے قدم مضبوط کر لیے۔ اگرچہ امریکہ نے اپنے کٹھ پتلی حکمران یہاں بٹھائے رکھے مگر وہ پورے افغانستان پر اپنا اقتدار قائم کرنے میں مکمل ناکام رہے۔ 17 فروری 2009ء صدر براک اوباما نے کمانڈر اِن چیف کی حیثیت سے اپنا پہلا فوجی فیصلہ کیا اور مزید 17 ہزار فوجی افغانستان بھیجنے کا

حکم دیا تا کہ وہ بڑھتی ہوئی شورش کو روک سکیں۔ یہ دستے ان 38 ہزار امریکی اور 32 ہزار نیٹو فوجیوں کے ساتھ مل گئے، جو پہلے سے ہی افغانستان میں موجود تھے۔ یکم مئی 2011ء کو امریکہ نے پاکستان میں داخل ہو کر کارروائی کر کے اسامہ بن لادن کو شہید کر دیا۔ اس وقت تک افغانستان میں امریکی فوج کی تعداد ایک لاکھ سے بھی زیادہ تھی اور افغانستان اور پاکستان میں طالبان اور دیگر دھڑوں کے خلاف سی آئی اے کے ڈرون حملے بھی جاری تھے۔ 23 اپریل 2013ء کو ملا عمر رحمۃ اللہ علیہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ امریکی حکام کے سفارت کاروں نے گزشتہ 10 ماہ کے دوران جرمنی اور قطر میں افغان طالبان رہنماؤں کے ساتھ چھ سات ملاقاتیں کی ہیں۔ 27 مئی 2014ء کو صدر اوباما نے سال کے اختتام تک 9,800 فوجیوں کو چھوڑ کر باقی تمام امریکی دستوں کو افغانستان سے نکالنے اور 2016ء کے اختتام تک باقی فوجیوں کے انخلا کا عندیہ دیا تھا۔ 28 دسمبر 2014ء کو زیادہ تر جنگی دستوں کے انخلا اور جنگ کی قیادت افغانستان کو منتقل کر کے امریکی جنگی مشن کی باضابطہ تکمیل کر دی گئی۔ تقریباً 10 ہزار امریکی فوجی بدستور افغانستان میں موجود تھے، جن کی توجہ افغان فوج کو تربیت دینے پر رہی۔ 21 اگست 2017ء صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے طالبان کو کابل حکومت کے ساتھ مذاکرات پر مجبور کرنے کے لیے لامحدود امریکی فوج اتارنے کا اعلان کیا۔ 4 ستمبر 2018ء طالبان کے ساتھ مذاکرات کے لیے افغانی سفارت کار زلمے خلیل زاد کو امریکا کا نمائندہ خصوصی مقرر کر دیا گیا۔ متعدد ملاقاتوں کے بعد 29 فروری 2020ء میں امریکا نے دوحہ میں طالبان کے ساتھ فوج کے انخلا کا معاہدہ کر لیا جس کے مطابق افغان حکومت اور طالبان آپس میں امن مذاکرات کریں گے۔ 12 ستمبر 2020ء میں افغان حکومت اور طالبان مذاکرات کاروں نے کئی ماہ کی تاخیر کے بعد بالآخر دوحہ میں ہی امن مذاکرات کا آغاز کر دیا۔ اس طرح 2 دسمبر 2020ء میں افغان حکومت اور طالبان امن مذاکرات کے طریق کار پر اپنے ابتدائی معاہدے تک پہنچ گئے۔ 19 سال کی خونریز جنگ کے بعد یہ پہلا تحریری معاہدہ تھا۔ 14 اپریل 2021ء کو امریکی صدر جو بائیڈن نے اعلان کیا کہ امریکی افواج طالبان کے ساتھ معاہدے کے تحت مئی تک فوجی انخلا نہیں کر سکتے۔ البتہ 11 ستمبر سے پہلے غیر مشروط انخلا مکمل ہو جائے گا۔ 26 جون 2021ء جو بائیڈن نے وائٹ ہاؤس میں افغان صدر اشرف غنی سے

ملاقات کی اور کہا کہ اب افغان اپنے مستقبل کا خود فیصلہ کریں تاہم سکیورٹی حوالوں سے ان کی امداد جاری رکھنے کا یقین دلایا۔ مگر 2 جولائی 2021ء کو امریکا نے کابل کے نواح میں واقع اپنا سب سے بڑا فوجی اڈہ بگرام اچانک خالی کر دیا اور یوں ایک سپر پاور کی فوج رات کی تاریکی میں فرار ہوگئی۔ امریکی انٹیلی جنس رپورٹس اور عالمی مبصرین کی رائے کے مطابق طالبان تین ماہ یا اس سے زائد عرصہ کے بعد افغانستان میں کوئی مؤثر کاروائی کر سکیں گے مگر یہ اندازے غلط ثابت ہوئے اور ایک ہفتے سے بھی کم مدت میں طالبان ملک کے بیشتر صوبوں پر قابض ہوگئے۔ طالبان کے سب سے بڑے دشمن رشید دوستم اور اس کے ساتھیوں نے خوفزدہ ہوکر راہ فرار اختیار کرتے ہوئے ازبکستان میں پناہ لے لی افغان نائب صدر اور وزیر خزانہ سمیت کئی دیگر اعلیٰ عہدیدار بھی ملک سے فرار ہوگئے اور جس کے بعد بڑی سرعت کے ساتھ چند دنوں کے اندر اندر افغان طالبان مجاہدین نے دارالحکومت کابل سمیت پورے ملک پر قبضہ کر کے امارات اسلامیہ افغانستان کے پرچم لہرا دیے اور یوں اس صدی کے سب سے بڑے فرعون امریکہ اور اس کے اتحادی 30 نیٹو ممالک کی افواج کو اللہ تعالیٰ نے شکست فاش سے دوچار کر دیا۔ پھر چشم فلک نے یہ بھی دیکھا کہ 20 سالوں سے امریکہ کی تربیت یافتہ 3 لاکھ 7 ہزار کے لگ بھگ افغانیوں کی فوج پورس کے ہاتھی ثابت ہوئی اور پھٹے پرانے کپڑوں اور جوتوں میں ملبوس، بے سروسامانی کا شکار طالبان مجاہدین کے سامنے ریت کی دیوار کی طرح تحلیل ہوگئی پورے ملک میں کہیں بھی قابل ذکر مزاحمت بھی نہ ہوسکی۔ سابق افغان صدر اشرف غنی جو بڑھکیں مار رہا تھا کہ وہ اپنی فوج کے بل بوتے پر چھ ماہ کے اندر طالبان کو نیست و نابود کر کے رکھ دے گا۔ صدارت کے عہدے سے مستعفی ہوکر بڑی بے چارگی کے عالم میں اپنے حواریوں سمیت ملک سے فرار ہوکر تاجکستان چلا گیا جہاں سے اس کی اگلی منزل امریکہ ہوسکتی ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کی مدد اور نصرت سے کوئی گولی چلائے بغیر پورے ملک پر طالبان مجاہدین کا قبضہ ہوگیا۔ 15/اگست 2021ء کو کابل کے صدارتی محل میں طالبان رہنماؤں نے سورۃ النصر کی تلاوت کی اور سجدۂ شکر ادا کیا انھوں نے جنگ بند کرنے اور سب مخالفین کے لیے عام معافی کا اعلان کر دیا اور ساتھ ہی یہ عزم دہرایا کہ امن وامان کے قیام اور ملک وملت کی ترقی اور ان کی حفاظت ان کا اصل فریضہ ہے اور وہ اپنے فرائض احسن طریقے سے نبھانے کے لیے افغان

عوام سے تعاون کے خواہش مند ہیں۔

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

امریکہ نے ایک بڑی عالمی طاقت (Super power) ہونے کے زعم میں نا صرف خود بلکہ اپنے 30 نیٹو ممالک کی جدید ترین اسلحہ سے لیس افواج کے ساتھ، مادی وسائل سے محروم نہایت ہی غریب ملک پر حملہ آور ہوا اور وحشیانہ بمباری کر کے ظلم و بربریت کی انتہا کر دی۔ افغانستان میں نام نہاد مغربی جمہوری نظام قائم کرنے کے لیے دو کھرب ڈالرز خرچ کیے۔ پارلیمنٹ کے ایوان زیریں میں 27 فیصد نشستیں خواتین کے لیے مختص کیں۔ 83 ارب ڈالرز کے اخراجات سے 3 لاکھ افغانیوں کی فوج تیار کی اور انھیں جدید ترین اسلحہ اور دیگر فوجی ساز و سامان سے لیس کیا مگر کچھ بھی کام نہ آیا۔ امریکی مکافات عمل کا شکار ہیں ان کے اندرونی حالات خراب سے خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ ناقابل شکست ہونے کا تصور لئے مغرور و متکبر امریکی افواج کو عالمی سطح پر پے در پے شکستیں ہونے لگیں تو وہ نفسیاتی مریض بن کر رہ گئے، حاضر سروس اور ریٹائرڈ فوجیوں میں خودکشی کا رجحان بڑھ رہا ہے، اب تک 30 ہزار فوجیوں نے خودکشی کی ہے۔ افغانستان سے واپس جانے والے ائیر فورس کے ایک آفیسر کی ویڈیو وائرل ہوئی ہے جس میں اس آفیسر نے امریکی صدر جو بائیڈن کو کھلے عام کھری کھری سنائی ہیں کہ امریکی صدور نے ایک بے مقصد جنگ میں اپنے فوجیوں کو مرنے مارنے کے لیے بھیجا اور بے گناہ عورتوں بچوں کو قتل کروایا ہے، جہاں بڑی مشکل سے صدر جو بائیڈن نے جان چھڑائی اور بھاگ نکلے۔ اس جنگ کو بھڑکانے میں شرمناک کردار بڑی طاقتوں کی رکھیل نام نہاد انجمن اقوام متحدہ UNO کا رہا جس نے ہمیشہ بڑی طاقتوں کی کٹھ پتلی ہونے کا کردار نبھایا اور دنیا کی مظلوم انسانیت کو بڑی طاقتوں کیلئے ہمیشہ تر نوالہ بنائے رکھا۔ بے شک اس جنگ میں لاکھوں مسلمانوں کی شہادت اور دربدری کی ذمہ داری اقوام عالم پر بھی عائد ہوتی ہے جنھوں نے مظلوم افغانیوں کی بجائے ظالم امریکی حکومت کے مفادات کا ساتھ دیا۔ اس جنگ میں پڑوسی ملک اسلامی جمہوریہ پاکستان بھی شدید متاثر ہوا جس نے لاکھوں جانوں کی قربانی دی اور کئی کھرب ڈالرز کی اپنی معیشت تباہ کی اور دہشت گردی کے نام پر لڑی جانے والی افغان جنگ میں اپنا نقصان کروایا۔ بلاشبہ نام نہاد دہشت گردی کی اس جنگ میں اس

وقت کے فوجی حکمرانوں کی غلط پالیساں بھی شامل ہیں جنھوں نے فقط اپنے اقتدار کو طول دینے کیلئے امریکہ سے دوستی کے جھانسے میں آ کر ''سب سے پہلے پاکستان'' کا نعرہ لگا کر ملک کو اس پرائی جنگ میں دھکیل دیا۔ حالانکہ پوری قوم اس جنگ میں شمولیت کے سخت خلاف تھی۔ پاکستان نے اس جنگ کا خمیازہ معیشت کی تباہی اور دہشت گردی کی صورت میں بھگتا، جو ابھی تک اس جنگ میں شمولیت کے خلاف پائے جانے والے جذبات کی شکل میں سامنے آ رہے ہیں۔ امریکہ بہادر یہ سمجھتا تھا کہ یہ مقابلہ ایک ہاتھی اور چیونٹی کے درمیان کا ہے مگر افغان مجاہدین طالبان کو اپنے پیارے رب پر پورا پورا یقین تھا کہ فتح و نصرت مومن کا ہی مقدر ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَ يُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ (سورۃ محمد:7)

''اے اہل ایمان! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا اور تم کو ثابت قدم رکھے گا''

افغان مجاہدین کو مسبّب الاسباب اپنے وحدہ لاشریک ربّ العالمین پر کامل یقین اور بھروسہ تھا کہ وہ ان کو فتح اور کامیابی دے گا۔

امریکی صدر بش نے واضح طور پر اس جنگ کو صلیبی جنگ سے تشبیہ دے کر اُمت مسلمہ کو للکارا تھا مگر بدقسمتی کی انتہا ہے کہ کفر و اسلام کی اس جنگ میں مسلم دنیا کے حکمرانوں نے طالبان مجاہدین کو بالکل بے یار و مددگار اور تنہا چھوڑ دیا حالانکہ مسلمان عوام کی اکثریت ان کی حامی تھی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فتح و نصرت کی اُمید لئے ایک مختصر جماعت (فِئَةٌ قَلِيْلَةٌ) افغان مجاہدین طالبان نے 21 سال تک بڑی مشکلات کے باوجود استقامت دکھائی اور بالآخر کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ افغان مجاہدین طالبان کی شاندار فتح مغرب سے مرعوب نام نہاد مفکرین اور لبرلز کے منہ پر زنّاٹے دار تھپڑ بھی ہے امریکی نمک خوار بن کر اس کی برتری کے گن گاتے رہے اور جہاد اور مجاہدین کو بدنام کر کے ان کے حوصلے پست کرنے کی سازشیں کرتے رہے ہیں۔

فضائے بد رپیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اُتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

طالبان کو حیرت انگیز طور پر سفارتی کامیابیاں حاصل ہو رہی ہیں۔ وائٹ ہاؤس امریکہ میں، بھارت، افغان حکومت اور امریکہ کے نمائندے اس صورت حال پر گہری نظر رکھے

ہوئے ہیں۔ دوسری طرف طالبان کی قیادت علاقائی ممالک کے تحفظات کو دور کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔ ایرانیوں، روسیوں اور وسط ایشیا کے ممالک کے ساتھ بات چیت کی ہے اور چینیوں کو یقین دلایا کہ مسلم اقلیتوں کے خلاف بیجنگ کے مظالم کو چیلنج کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے اور امریکیوں سمیت ہر کسی کو یہ بھی بتایا ہے کہ طالبان کی حکومت افغانستان کی سرزمین کو کسی دوسرے ملک کے خلاف کارروائیوں کے اڈے کے طور پر استعمال نہیں ہونے دے گی۔ اقوام متحدہ میں بیٹھے امریکی، بھارتی اور اسرائیلی گماشتے اب بھی افغانستان میں حق وانصاف اور امن کی کوششوں کا ساتھ دینے کی بجائے اپنے مفادات کیلئے سرگرداں ہیں۔ برطانیہ جرمنی اور اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کے بیانات تشویشناک ہیں کہ طالبان ملک میں اسلامی شریعت اور اسلامی نظام قائم رکھنے سے باز رہیں۔ اس طرح اقوام عالم کو گمراہ کر کے دین اسلام اور مسلمانوں کو نشانہ بنانے کی پالیسی دہرانے کی سازش ہو رہی ہے۔ دین اسلام کے علمبردار مسلمانوں کی صدیوں بعد حیرت انگیز کامیابی پر عالم کفر لرزاں ہے اور ان پر سکتہ طاری ہے۔ کیونکہ یہ کامیابی عالم اسلام کے مظلوم مسلمانوں کے لئے روشنی کی کرن کے مصداق ہے۔ افغانستان میں پرامن اقتدار کی منتقلی عالم کفر کو گوارا نہیں اور افغانستان میں امارتِ اسلامیہ کی حکومت اور اسلامی نظام کا قیام ان کو کسی بھی طور گوارا نہیں۔ اس لئے ابھی سے طالبان حکومت کو تسلیم نہ کرنے کی باتیں بھی ہو رہی ہیں اندیشہ ہے کہ امریکہ مشرقِ وسطیٰ کے دیگر اسلامی ممالک میں خانہ جنگی کروانے کے منصوبے کے بعد اب افغانستان میں بھی فرقہ واریت، لسانیت اور قومیّت کے جذبات کو ہوا دیکر یہاں خانہ جنگی کروانے کی سازش کرے گا۔ ایٹمی قوت پاکستان کو عالم اسلام کی بہتری کے لیے اس وقت اپنا بھرپور کردار ادا کرنے کی فوری اور اشد ضرورت ہے۔ اندریں حالات افغانستان اور دیگر مسلمان ممالک میں خانہ جنگی، بدامنی اور انتشار کی روک تھام اور کفار کی سازشوں سے بچنے کیلئے امت مسلمہ کو اپنے داخلی اختلافات کو ختم کر کے متفقہ لائحۂ عمل اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔۔ امت مسلمہ۔۔ او آئی سی۔۔ اپنا اپنا مثبت کردار ادا کر کے افغانستان کو مزید تباہی سے بچالیں۔

؎ یہ کس نے ہم سے لہو کا خراج پھر مانگا
ابھی تو سوئے تھے مقتل کو سرخرو کر کے

مدیر کے نام

یومِ آزادی پر صرف ہلّہ گلہ یا یومِ تشکّر اور مادر پدر آزادی

1 محمد عمر دراز قریشی، لاہور

ے زندگی در جستجو پوشیدہ است
اصل اُو در آرزو پوشیدہ است

14 اگست کو شکرانہ کا روزہ رکھنا، یہ تجویز انتہائی بھلی ہے۔ اہالیانِ پاکستان مع جری افواج واقعتاً شکر گزار بن سکتے ہیں اگر وہ یہ روزہ رکھیں۔ اس ضمن میں صدر مملکت آرڈیننس جاری کر سکتے ہیں یا پارلیمنٹ قرارداد پاس کر سکتی ہے۔ "علماء اُمتی کانبیاء بنی اسرائیل" کے مصداق علماء کا یہ مفوضہ کردار لابدمنہ ہے۔ نہ جانے کیوں علمائے اہل سنت کی توجہ اس امر کی جانب اب تک نہیں گئی۔

ے بدن ہے جس کا منزہ نہیں ہے جز تہہ آب
ہے اس کی روح خدائی میں اب تک غرقاب

برطانوی فرعون تو امروز بھی سلامتی کونسل کے 5 بڑوں کے جلو میں 72 سال سے مع بدن و جان و روح Expand ہی ہوا ہے۔ المختصر ہم سے ہر ایک کو 10-10 دیوبندی و بریلوی و اہلحدیث برادران تک یہ بات پہنچانی چاہیے تاکہ وہ اپنے حلقہ اثر کے علماء کی ذہن سازی کریں۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست ۔ مقامِ شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں۔ شاید حوصلوں کے زیادہ ہونے سے یہ امر داخل حیاتِ عوام مسلم ہو سکے۔ آیئے بارش کا پہلا قطرہ بنئے۔

ایک بات اس میں البتہ متقاضی غورِ محض ہے وہ ہے تصور دوئی۔ امر خدا تو 27 رمضان ہی تھا تو روزہ اس نے رمضان میں جذب کردیا۔ آیئے حکومت سے بھی ہم مع علماء یہی مطالبہ کریں کہ وہ 14 اگست کو delete کردے اور 27 رمضان المبارک کو روزہ نہ رکھنے کو ایک ماہ کی سزا پاکستان کی ہر عدالت دے تا آنکہ دوقومی نظریہ نکھر کر سامنے آئے اور ہم بھارت سے روحانی سطح پر ہمیشہ کے لیے علیحدہ ہوسکیں۔ گر قبول افتدز ہے عزو شرف۔

2 حافظ ثاقب نذر۔ جھنگ سٹی

مملکت خداداد پاکستان 14 اگست 1947ء، بمطابق 27 رمضان المبارک 1366ھ کو منصۂ شہود پر آیا تھا۔ اسی لیے ملک میں ہر سال 14 اگست کو یومِ آزادی منایا جاتا ہے۔

حکمت بالغہ کے حالیہ شمارے کے صفحہ 5 پر حدیث مبارکہ درج کی گئی ہے، جس کے مطابق رسولِ خدا ﷺ نے مسلمانوں کو عاشوراء (دس محرم) کے دن روزہ رکھنے کا حکم اس لیے دیا کہ اس دن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے روزہ رکھا تھا کیونکہ بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے آزادی ملی تھی۔ پھر اسی صفحہ کے حاشیہ پر لکھا ہے کہ ''ہمیں فرعون سے بڑے خدائی کے دعویدار برطانوی سامراج سے 14/اگست 1947ء کو رہائی نصیب ہوئی۔ علماء اس دن کا روزہ رکھنے کا عوام کو مشورہ دیں تاکہ عوام آزادی کی نعمت کو اللہ کی نعمت تصور کریں''۔ اور گزشتہ چند سالوں سے بھی آپ حکمت بالغہ کے ماہِ رمضان المبارک کے شماروں میں یہ مطالبہ پیش کررہے ہیں کہ ''پاکستان کا یومِ آزادی 27 رمضان المبارک کو بھی منایا جائے'' تاکہ ہمارا آئینی اور اسلامی تشخص نمایاں ہوسکے۔

واقعی یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ 27 رمضان دینی لحاظ سے اہم ہونے کے علاوہ یہ اہل پاکستان کے لیے یومِ آزادی کا دن بھی ہے اس دن آزادی کی نعمت پر خصوصی شکرگزاری کرنی چاہیے۔ اس دن فرض روزہ رکھا جاتا ہے، اس لیے الگ سے شکرانے کے روزہ کا امکان نہیں ہے، البتہ علماء کرام اس بارے میں غور کریں کہ اگر اس میں کوئی شرعی حرج نہیں ہے تو وہ مسلمانانِ پاکستان کو ترغیب دیں کہ 14/اگست کو آزادی کی نعمت پر اظہارِ تشکر کے لیے کا نفلی روزہ رکھیں۔

بات دراصل یہ ہے کہ ہمیں اپنے خوشی وغمی کے مواقع بھی شریعت اسلام کے ہدایت کردہ طریقہ پر ہی گزارنے چاہئیں۔ ہمارے آباء واجداد اور بزرگوں نے حصولِ آزادی کی خاطر

کیا کیا قربانیاں دیں اور کیوں دیں اور وقت کے فرعون صفت حکمرانوں سے مقابلہ کر کے کس مقصد کے لیے ہمیں ایک آزاد ملک لے کر دیا؟ اس قسم کی باتیں ہماری نئی نسل کے سامنے نہیں لائی جاتیں۔ یہ ملک تو اسلام کے نام پر بنا تھا اور یہ اسلام کے نفاذ سے ہی مستحکم ہوگا اور ترقی کرے گا۔ لیکن آج کے حالات دیکھ کر تو افسوس ہوتا ہے کہ اس ملک میں جشن آزادی کے نام پر ناچ گانا، باجے گاجے، فضول خرچی، مردوں کے زنانہ لباس، عورتوں کی بے پردگی وغیرہ سب غیر اسلامی طور طریقوں پر عمل ہو رہا ہے۔ اگر اصلاح کی کوشش نہ کی گئی تو آئندہ چند سالوں میں یہی بیہودہ طور طریقے معاشرے میں رواج پا کر جشن آزادی کا لازمی حصہ بن سکتے ہیں۔ اس کی اصلاح کے لیے ہمیں ضرور کوششیں کرنی چاہئیں اور ہمیں یہ خوشی کے دن صحیح اسلامی طریقے کے مطابق منانے چاہئیں۔ اس سلسلہ میں آپ اپنے جریدہ حکمت بالغہ کے ذریعے جو کاوش کر رہے ہیں وہ قابل تحسین ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے اور جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین۔

الٰہی ہم میں بھی صدیقؓ سا ایمان پیدا کر
عمر فاروقؓ سا کوئی جری انسان پیدا کر
جہاں سے گم حیا ہو وہاں عثمانؓ پیدا کر
علی المرتضیٰؓ شیرِ خدا کی آن پیدا کر
مسلمانوں میں دورِ اوّلین کی شان پیدا کر
میرے مولا! دلوں میں جذبۂ ایمان پیدا کر

ارسال کردہ: غلام احمد بھٹی، جھنگ شہر

ماہنامہ
حکمت بالغہ
میں

’’فتنۂ دجّال کے منحوس دور کی ایمان سوز کالی گھٹائیں‘‘

کے عنوان سے سلسلہ وار مضامین
کی 8 قسطیں شائع ہو چکی ہیں

ان شاء اللہ 9 ویں قسط

’’مغربی صہیونی قوتوں کی ___ ایک ___ ’حقیقی‘ رسول (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) سے متوقع جنگ (STAR WARS) کے خوفناک حالات‘‘

کے عنوان سے آئندہ ماہ شائع ہو گی

(مدیر حکمت بالغہ)

ملتِ اسلامیہ افغانستان
علامہ اقبال کی نگاہ میں

1

آسیا یک پیکرِ آب و گل است
ملّتِ افغاں در آں پیکر دل است!

از فسادِ او فسادِ آسیا
در کشادِ او کشادِ آسیا

تا دلِ آزاد است آزاد است تن
ورنہ کاہے در رہِ باد است تن!

ہمچو تن پابندِ آئین است دل
مردہ از کیں زندہ از دین است دل!

قوتِ دیں از مقامِ وحدت است
وحدت ار مشہود گردد ملّت است

(جاوید نامہ)

ترجمہ

براعظم ایشیا پانی اور مٹی کا ایک پیکر ہے اور اس پیکر میں دل کی حیثیت ملت افغان کو حاصل ہے۔

اس کا بگاڑ پورے ایشیا کے بگاڑ کا باعث ہے اور اس کی خوشحالی پر پورے ایشیا کی خوشحالی کا دارومدار ہے۔

دل جب تک آزاد رہتا ہے جسد کو بھی آزادی میسر رہتی ہے، بصورت دیگر حالات کے طوفانی جھکڑ کے آگے جسد کی حیثیت ایک تنکے سے زیادہ نہیں ہوتی۔

دل بھی جسم کی طرح ایک ضابطے کا پابند ہے، نفرت و دشمنی کی وجہ سے دل مردہ ہوجاتا ہے۔ جبکہ دل کی حیات دین کے ساتھ وابستگی پر موقوف ہے۔

دین کی قوت اور شان و شوکت کا دارومدار وحدت و یکجہتی پر ہے۔ وحدت اگر پیدا ہوجائے تو یہی اصل ملت ہے۔

2

قبائل ہوں ملّت کی وحدت میں گُم
کہ ہو نام افغانیوں کا بلند
محبت مجھے اُن جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند!

(نظم: ''خوش حال خان کی وصیت''، بالِ جبریل)

3

افغان باقی! کہسار باقی!
اَلحُکمُ لِلّٰہ! اَلمُلکُ لِلّٰہ!
حاجت سے مجبور مردانِ آزاد
کرتی ہے حاجت شیروں کو روباہ!
محرم خودی سے جس دم ہوا فقر
تو بھی شہنشاہ میں، بھی شہنشاہ!
قوموں کی تقدیر وہ مردِ درویش
جس نے نہ ڈھونڈی سلطاں کی درگاہ!★

(نظم: ''محراب گل خان کے افکار''، ضربِ کلیم)

(بشکریہ ہفت روزہ ندائے خلافت 4 جون 1998ء)

★ علمائے دین کی حکمرانوں سے دوری اور حکمرانوں کی امریکہ (اور IMF) کی غلامی سے دوری

Vol 15
CPL No: FD 30/07
HIKMAT-E-BAALGHA
SEPTEMBER 2021
No 09

ایک صدی پہلے علامہ اقبال علیہ الرحمہ کی اُمت مسلمہ کے قلب عالم عرب کے حکمرانوں کو نصیحتیں

حرفے چند با اُمت عربیہ

اے در و دشتِ تو باقی تا ابد
نعرۂ لَا قَیصر و کِسریٰ کہ زد؟
کارِ خود را اُمتاں بردند پیش
تو ندانی قیمت صحرائے خویش
اُمتے بودی ، اُمم گردیدۂ
بزمِ خود را خود ز ہم پاشیدۂ
ہر کہ از بند خودی وارَست، مُرد
ہر کہ با بیگانگاں پیوست، مُرد
آنچہ تو باخویش کردی، کس نکرد
رُوحِ پاکِ مصطفےٰ ﷺ آمد بدرد!
اے ز افسونِ فرنگی بے خبر
فتنہ ہا در آستینِ او نگر
از فریبِ او اگر خواہی اماں
اشترانش را ز حوضِ خود براں
حکمتش ہر قوم را بے چارہ کرد
وحدتِ اعرابیاں صد پارہ کرد
تا عرب در حلقہ دامش فتاد
آسماں یک دم اماں او را نداد
عصر خود را بنگر اے صاحب نظر
در بدن باز آفریں رُوحِ عمرؓ
قوت از جمعیتِ دینِ مبیں
دیں ہمہ عزم است و اخلاص و یقیں

اے اُمتِ عربیہ! تیرے راستے اور صحرا سدا باقی رہیں گے (اسلام کا دامن تھام کر) تو نے ہی 'لا قیصر اور لا کسریٰ' کا پیغام دیا تھا (تلمیح ہے مشہور حدیث لَا کِسْرٰی وَ لَا قَیْصَر کی طرف)۔ دوسری قوموں نے اپنے کام کو آگے بڑھایا تم اپنے صحراؤں میں پیٹرول کی دولت کو نہیں جانتے۔ تم ایک اُمت تھے، اب کئی فرقے بن گئے ہو تم نے اپنی محفل کو خود ہی منتشر کر دیا ہے۔ جس نے خودی کے بند کو توڑا، وہ مر گیا جو بیگانوں سے مل گیا، وہ مر گیا۔ جو کچھ تم نے اپنے ساتھ کیا ہے وہ کسی نے نہیں کیا ہوگا تمہارے اس عمل سے حضرت محمد ﷺ کی روحِ پاک کو تکلیف پہنچی ہے۔ اے عربو! تم صہیونی استعمار کے آلہ کار، فرنگی (برطانوی سامراج) کے سحر سے بے خبر ہو اس کی آستین کے فتنوں (100 سالہ عالمی اقتدار پر قبضہ کا منصوبہ) کو دیکھو۔ اے عالم عرب! اگر صہیونی استعمار کے فتنوں سے بچنا چاہتے ہو تو اس کے اونٹوں (آلہ کار اور جاسوسوں از قسم لارنس عربیہ وغیرہ) کو اپنے حوضوں (آئل فیلڈز) سے بھگا دو۔ اے عالمِ عرب! (دیکھو) اس کے داؤ پیچوں اور چالوں نے ہر قوم کو لاچار کر دیا ہے اور اس دشمن نے عالم (اسلام) کی وحدت کو سینکڑوں ٹکڑوں میں بانٹ دیا ہے۔ جب سے عالم عرب اس مغربی استعمار کے آلہ کار فرنگی (اور آج امریکی) جال میں پھنسے ہیں آسمان (حالات و واقعات) نے انھیں (ان کی سازشوں سے) ایک دن کا امن و سکون نہیں بخشا۔ اے صاحب نظر! اپنے زمانے پر غور کر اپنے بدن میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رُوح پھر سے پیدا کر۔ قوت دینِ مبین کی جمعیت سے حاصل ہوتی ہے دین سراسر عزم، اخلاص اور یقین پر مبنی ہے۔ (کلیاتِ اقبال فارسی، صفحہ ۸۳۵)